ہفت روزہ
ندائے خلافت
لاہور

8 جنوری 2003ء - ۵ ذوالعقدہ ۱۴۲۳ھ

جلد : 12 شمارہ : 1

☆ سالِ اقبال اور ہمارا طرزِ فکر (اداریہ)
☆ حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں! (تجزیہ)
☆ قصوروار کون؟ (افکارِ معاصر)

آخرت پر ایمان اور صحابہؓ کرام

''.....صحابہؓ کرام اس بات پر غیر متزلزل یقین رکھتے تھے کہ انہیں رب العالمین کے سامنے کھڑے ہونا ہے، پھر اُن کے چھوٹے بڑے اور معمولی و غیر معمولی ہر طرح کے اعمال کا حساب لیا جائے گا۔ اس کے بعد یا تو نعمتوں بھری دائمی جنت ہوگی یا عذاب سے بھڑکتی ہوئی جہنم۔ اس یقین کا نتیجہ یہ تھا کہ صحابہؓ کرام اپنی زندگی اُمید و بیم کی حالت میں گزارتے تھے، یعنی اپنے پروردگار کی رحمت کی اُمید رکھتے تھے اور اس کے عذاب کا خوف بھی اور ان کی کیفیت وہی رہتی تھی جو اس آیت میں بیان کی گئی ہے کہ:

﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَا اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ۝﴾ (المومنون: ٦٠)

''وہ جو کچھ کرتے ہیں دل کے اس خوف کے ساتھ کرتے ہیں کہ انہیں اپنے رب کے پاس پلٹ کر جانا ہے۔''

انہیں اِس کا بھی یقین تھا کہ دنیا اپنی ساری نعمتوں اور مصیبتوں سمیت آخرت کے مقابل مچھر کے ایک پر کے برابر بھی نہیں اور یہ یقین اتنا پختہ تھا کہ اس کے سامنے دنیا کی ساری مشکلات، مشقتیں اور تلخیاں ہیچ تھیں۔ اس لئے وہ ان مشکلات اور تلخیوں کو کوئی حیثیت نہیں دیتے تھے۔

ان ہی پُر خطر، مشکل ترین اور تیرہ و تار حالات میں ایسی سورتیں اور آیتیں بھی نازل ہو رہی تھیں جن میں بڑے ٹھوس اور پُر کشش انداز سے اسلام کے بنیادی اصولوں پر دلائل و براہین قائم کئے گئے تھے اور اس وقت اسلام کی دعوت اِنہی اصولوں کے گرد گردش کر رہی تھی۔ ان آیتوں میں اہلِ اسلام کو ایسے بنیادی اُمور بتلائے جا رہے تھے جن پر اللہ تعالیٰ نے عالمِ انسانیت کے سب سے باعظمت اور پُر رونق معاشرے یعنی اسلامی معاشرے کی تعمیر و تشکیل مقدر کر رکھی تھی۔ نیز ان آیات میں مسلمانوں کے جذبات و احساسات کو پامردی و ثابت قدمی پر اُبھارا جا رہا تھا۔''

(مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری کی تصنیف ''الرحیق المختوم'' صفحہ ۱۷۳ سے ایک اقتباس)

سورۃ البقرہ (۸۴)

ڈاکٹر اسرار احمد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ۝ اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ۝﴾ (آیات: ۱۶۵، ۱۶۶)

''اور کچھ لوگ وہ ہیں جو بناتے ہیں اوروں کو اللہ کا مدمقابل اور ان سے ایسے محبت کرتے ہیں جیسے اللہ سے محبت کرنا چاہئے اور (البتہ) جو ایمان لائے ہیں وہ تو اللہ سے شدید محبت کرتے ہیں اور کاش جان لیتے جنہوں نے ظلم کیا (جو وہ اس وقت جانیں گے) جب (آنکھوں سے) دیکھ لیں گے عذاب کہ ساری قوتوں کا مالک اللہ ہے اور بے شک اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے۔ (خیال کرو) جب بیزار ہو جائیں گے وہ جن کی تابعداری کی گئی ان سے جو تابعداری کرتے رہے اور دیکھ لیں گے عذاب کو اور ٹوٹ جائیں گے ان کے تعلقات''۔

انسان کی شدید ترین محبت تو اللہ کے ساتھ ہونی چاہئے مگر یہ مشرکین جن کی ذہنی کمند اللہ تک نہیں پہنچ پاتی وہ کسی اور کو معبود سمجھ کر اور محبوب بنا کر پوجنا شروع کر دیتے ہیں۔ جو لوگ اللہ کو چھوڑ کر کسی اور کو اس کا مدمقابل بنا لیتے ہیں اور پھر اس سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی اللہ سے کرنی چاہئے تو ایسے لوگ صریحاً غلطی پر ہیں۔ یہ ظلم آج تک جاری ہے مثلاً آج انسانوں کی ایک عظیم اکثریت نے وطن کو خدا بنا لیا اور گویا وطن کی پرستش شروع کر دی' دھرتی کو ماتا کہا اور اس کی جے کا نعرہ لگایا' حالانکہ جے تو صرف اللہ کے لئے ہونی چاہئے۔ عظمت تو بس اللہ کے لئے ہے۔ زمین کی تو کوئی عظمت نہیں ہے مگر افسوس کوئی قوم پرست ہے' کوئی وطن پرست ہے' کوئی کسی اور شے کا پرستار بنا پھرتا ہے۔ گویا غیر اللہ کو اپنا مطلوب و مقصود بنا لیا ہے۔ یہی شرک ہے۔ لیکن جو صاحب ایمان ہوتے ہیں ان کی شدید ترین محبت بس اللہ ہی سے ہوتی ہے اور باقی ساری محبتیں اللہ کی محبت کے تابع ہوتی ہیں۔ والدین اولاد سے محبت کریں' بیوی اور شوہر ایک دوسرے سے محبت کریں' بچے ماں باپ کے ساتھ محبت کریں' اسی طرح ایک حد تک وطن سے بھی محبت کی جا سکتی ہے کہ یہاں ہمارے آباء و اجداد دفن ہیں' اس میں کوئی حرج نہیں لیکن پرستش صرف اللہ ہی کی ہوگی اور اللہ کی محبت تمام محبتوں سے بالاتر رہے گی۔ یہ توحید ہے اور اگر کوئی دوسری محبت بھی اللہ کی محبت کے برابر ہو گئی اور دل میں براجمان ہو گئی تو یہ شرک ہے کیونکہ یہ محبت میں شرکت ہو گئی۔

اگلی آیت میں ذکر ہے کہ دنیا میں کچھ لوگ لیڈر یا قبیلوں کے سردار ہوتے ہیں اور کچھ عام لوگ ہوتے ہیں۔ سردار یا لیڈر عوام الناس کو اپنے پیچھے لگا لیتے ہیں۔ مکہ میں جب رسول اللہ ﷺ نے توحید کی آواز بلند کی تو یہ سردار متفکر بلکہ مشتعل ہو گئے اور کمزوروں کو دبانے لگے کہ ہمارے پیچھے چلو۔ یہ کون نیا آدمی آ گیا ہے جو عجیب باتیں کہہ رہا ہے (معاذ اللہ)۔ ہم نے تو اپنے بڑوں سے یہ باتیں نہیں سنی ہیں وہ تو ان بتوں ہی کو پوجتے تھے۔ یہ کون ہے جو ہمارے بتوں کی نفی کر رہا ہے لہٰذا تم ہماری ہی پیروی کرو۔ اس طرح یہ سردار عوام کو گمراہ کرنے لگے تاکہ لوگوں پر حقیقت نہ کھل سکے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر لوگوں نے حضور ﷺ کی دعوت قبول کر لی تو ان کی سرداری اور چودھراہٹ ختم ہو جائے گی۔ لہٰذا دنیا میں وہ اپنے پیروکاروں کو کسی نہ کسی طریقے سے اپنے پیچھے لگائے رکھتے ہیں مگر قیامت کے دن وہ ان سے لاتعلق ہو جائیں گے۔ پیروکار اب کہیں گے کہ تم ہمارے بڑے تھے ہم تمہارے پیچھے پیچھے چل رہے تھے تم نے ہی ہمیں اپنے راستے پر چلنے کو کہا تھا تو اب یہاں ہماری مدد کا بندوبست کرو۔ کوئی وکیل کوئی ضمانتی مہیا کرو مگر وہ سردار لوگ براءت کا اظہار کریں گے اور کہیں گے ہمارا تم سے کوئی تعلق نہیں ہم تو خود مصیبت کے اندر پڑے ہوئے ہیں تمہیں ہم کہاں سے سہارا دیں۔ اس طرح وہاں ان سرداروں اور پیروکاروں کا تعلق منقطع ہو جائے گا۔

☆ ☆ ☆

فرمانِ نبوی

فرائض کی پابندی کریں اور حدود سے آگے نہ بڑھیں

چوہدری رحمت اللہ بٹر

عَنْ اَبِیْ ثَعْلَبَةَ الْخُشَنِی جُرْثُوْمِ بْنِ نَاشِرٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ فَرَضَ فَرَائِضَ فَلَا تُضَیِّعُوْهَا وَحَدَّ حُدُوْدًا فَلَا تَعْتَدُوْهَا وَحَرَّمَ اَشْیَاءَ فَلَا تَنْتَهِکُوْهَا وَسَکَتَ عَنْ اَشْیَاءَ رَحْمَةً لَکُمْ وَغَیْرَ نِسْیَانٍ فَلَا تَبْحَثُوْا عَنْهَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ رَوَاهُ الدَّارُقُطْنِیُ وَغَیْرُه

''حضرت ابوثعلبہ خشنیؓ روایت فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بے شک اللہ نے (بہت سے) فرائض مقرر فرمائے ہیں لہٰذا تم ان کو ضائع نہ کرو اور اس نے (بہت سی) حدود مقرر فرمائی ہیں لہٰذا تم ان سے آگے نہ بڑھو اور (بہت سی) چیزوں کے کرنے کو اس نے حرام فرمایا ہے لہٰذا ان کا ارتکاب مت کرو اور اس نے تم پر رحم کھاتے ہوئے بہت سی چیزوں (کی حلت و حرمت) سے خاموشی اختیار فرمائی ہے اور یہ خاموشی اس کی طرف سے بھولنے کی وجہ سے نہیں لہٰذا تم ان کو مت کریدو''۔ (دارقطنی)

مثبت طور پر فرائض جو اللہ تعالیٰ نے فرض کئے ہیں ان کا التزام کرنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی جواب دہی ہے اور اللہ تعالیٰ نے بعض اشیاء حرام فرما دی ہیں اور باقی معاملہ مباح کا ہے جس میں مزید تنگی پیدا کرنا مطلوب نہیں ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حافظ عاکف سعید

سالِ اقبال اور ہمارا طرزِ عمل

سالِ گزشتہ یعنی ۲۰۰۲ء کو سرکاری طور پر سالِ اقبال قرار دیا گیا تھا اور ایک تازہ سرکاری اعلامیہ کے مطابق ۲۱ر اپریل ۲۰۰۳ء تک سالِ اقبال کا تسلسل جاری رہے گا۔

زندہ قومیں اپنے قومی و ملی مشاہیر اور اپنے اسلاف کی یاد کو اپنے لئے سرمایۂ افتخار سمجھتی ہیں اور اُن کی تعلیمات کو اپنے لئے مشعلِ راہ گردانتی ہیں۔ اسی حوالے سے دنیا میں یہ روایت چل نکلی ہے کہ ہر سال قومی و ملی مشاہیر کے دن منائے جائیں اور ان کی تلقین کردہ اُن خدمات کے اعتراف میں کسی ایک سال کو ان کے نام کے ساتھ مختص کر کے ان کے احسانات کا بدلہ چکانے کی کوشش کی جائے۔ اس بحث سے قطع نظر کہ اس طور پر دن اور سال منانا اسلامی تعلیمات اور مزاج سے ہم آہنگی رکھتا ہے یا نہیں' یہ امر واقعہ ہے کہ ملک و ملت کے محسنوں کے احسانات کا اعتراف کرنا' ان کی تعمیری مساعی کو قدر کی نگاہ سے دیکھنا اور ان کی تلقین کردہ اُن روشن تعلیمات سے کماحقہٗ فائدہ اٹھانا کہ جو مسلمانوں میں ایک جذبۂ تازہ اور صحیح اسلامی فکر کو اجاگر کرنے کا موجب ہوں' ہمارا دینی و اخلاقی فریضہ ہے۔۔۔ افسوس کہ ہم نے غیروں کی نقالی میں دن اور سال منانے کی روایت کو تو اختیار کر لیا اور اس حوالے سے سرکاری طور پر کچھ نمائشی تقریبات کے اہتمام کو اپنا شعار بنانے میں بھی کسی تساہل کا مظاہرہ نہیں کیا' لیکن جو کام فی الاصل ہمیں کرنا چاہئے تھا اس جانب کوئی توجہ نہیں کی۔ مشاہیر کے عظمتِ کردار سے اپنے لئے عملی رہنمائی حاصل کرنا اور ان کی روشن تعلیمات سے اپنے قلوب و اذہان کو منور کرنا سرے سے ہمارے پیشِ نظر نہیں ہوتا۔ بقول اقبال ؎

تجھے آباء سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار وہ کردار' تو ثابت وہ سیارا

علامہ اقبال کا شمار ہمارے قومی ہی نہیں عظیم ملّی مشاہیر میں بھی ہوتا ہے۔ وہ اس دور کے عظیم ترجمانِ قرآن تھے۔ انہیں عصرِ حاضر میں قافلۂ ملی کے عظیم ترین حدی خواں کا مقام حاصل تھا۔ محکومی و مایوسی کے اندھیاروں میں بھٹکتی عالمی ملت اسلامیہ کو اپنی فکر انگیز اور جذبہ پرور شاعری اور امید افزا پیغام کے ذریعے اِک ولولۂ تازہ عطا کرنے کا بے مثال اعزاز انہیں حاصل ہوا۔ انہیں اگر آج حکیم الامت اور مصورِ مفکرِ پاکستان کے القابات سے یاد کیا جاتا ہے تو یہ بلاسبب نہیں ہے۔ ان کا مقام اس سے بھی آگے ایک وژنری کا تھا جس نے ۱۹۳۰ء میں اپنے تاریخی خطبۂ الٰہ آباد میں پاکستان کے قیام کی ''بشارت'' دی تھی۔ قیامِ پاکستان کی پشت پر جو بے پناہ ملی جذبہ کارفرما تھا اس کی جوت اقبال نے ہی مسلمانانِ برصغیر کے سینے میں جگائی تھی۔ تعلیماتِ قرآنی پر مبنی اقبال کے فکر انگیز افکار اور ولولہ انگیز پیغام کو حرزِ جاں بنانا اور ان کی روشنی میں پاکستان کی منزل کا تعین کر کے قوم کا قبلہ درست کرتے ہوئے صحیح سمت میں پیش قدمی کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اگر ہم یہ نہیں کرتے تو محض نمائشی طور پر یومِ اقبال یا سالِ اقبال منا لینا خود فریبی کے سوا اور کچھ نہیں۔

سچی بات تو یہ ہے علامہ اقبال اور ان کی تعلیمات و افکار کے ساتھ بحیثیت قوم ہمارا رویہ منافقانہ ہے۔ جس ڈھب سے ہم سالِ اقبال مناتے ہیں' روحِ اقبال کو اس سے یقیناً خوشی نہیں ہوتی ہوگی بلکہ ہمارا طرزِ عمل اس کے لئے موجبِ اذیت ہوگا۔۔۔ اقبال کی خدمات اور تعلیمات کے گن گانے بلکہ قوالی کرنے میں تو ہم کسی سے پیچھے نہیں لیکن عملی زندگی میں اقبال کی تعلیمات کو ہم پرکاہ کے برابر وقعت دینے کے لئے تیار نہیں۔۔۔ اقبال ساری عمر مسلمانوں کو خودی کی تعمیر اور خودداری اختیار کرنے کی تلقین کرتے رہے اور آج ہم اپنی خودی' خودداری اور خودمختاری سب سے دستبردار ہو کر اسلام دشمن عالمی طاقتوں کی محکومی و چاکری میں مگن ہیں۔ اقبال نے قوم کو قرآن کی طرف متوجہ کیا اور ہدایت و رہنمائی کے حصول کی خاطر اس کی آیات میں غور و فکر اور اس کے ساتھ وابستگی کا درس دیا۔ وہ ''اعتصامش کن کہ حبل اللہ اوست'' اور ''قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلمان'' کا مسحور کن نغمہ فضا میں بکھیرتے اور ''کی محمد (ﷺ) سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں'' کا ابدی قانون قوم کو سناتے رہے اور ہم نے اجتماعی طور پر قرآن و سنت کی مخالفت پر کمر کس لی۔ ہمارا نظامِ معیشت ہو یا معاشرت' نظامِ زمینداری ہو یا جاگیرداری' اصولِ سیاست ہوں یا تجارت' سب قرآن و سنت کی تعلیمات سے کوسوں دور اور اقبال کے افکار سے یکسر متصادم ہیں۔ اقبال نے جدید مغربی تہذیب و تمدن کو ''نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی ۔ یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے'' قرار دے کر اس کے بھیانک اور مکروہ باطن کو بے نقاب کیا' لیکن ہم اسی غیر اسلامی تہذیب و تمدن کو اپنانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ ہمیں تو اقبال کا نام لیتے ہوئے شرم آنی چاہئے!۔۔۔ اور ہم چلے ہیں سالِ اقبال منانے! oo

تحریک خلافت پاکستان کا نقیب

ہفت روزہ — لاہور

ندائے خلافت

جلد 12 — شمارہ 1

2 تا 8 جنوری 2003ء

(۲۸ شوال تا ۵ ذوالقعدہ ۱۴۲۳ھ)

بانی: اقتدار احمد مرحوم

مدیر: حافظ عاکف سعید

نائب مدیر: فرقان دانش خان

معاونین: سید قاسم محمود' مرزا ایوب بیگ

سردار اعوان' محمد یونس جنجوعہ

نگران طباعت: شیخ رحیم الدین

پبلشر: محمد سعید اسعد مختار' طابع: رشید احمد چوہدری

مطبع: مکتبہ جدید پریس' ریلوے روڈ' لاہور

مقام اشاعت: 36- کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور

فون: 03-5869501 فیکس: 5834000

E-Mail:anjuman@tanzeem.org

Website:www.tanzeem.org

قیمت فی شمارہ : 5 روپے

سالانہ زرِ تعاون

اندرونِ ملک..... 250 روپے

بیرون پاکستان

☆ یورپ' ایشیا' افریقہ وغیرہ

..... 1500 روپے

☆ امریکہ' کینیڈا' آسٹریلیا وغیرہ

..... 2200 روپے

حیاتِ انسانی کی عظیم ترین حقیقت حیاتِ اُخروی ہے جبکہ حیاتِ دنیوی کی سب سے بڑی حقیقت موت ہے

حیاتِ دنیوی کی ایک بڑی حقیقت یہ بھی ہے کہ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ قوائے انسانی کمزور ہوتے چلے جاتے ہیں

طویل العمری کے باعث میری صحت چونکہ مسلسل گر رہی ہے لہٰذا میں آئندہ خطاب جمعہ کی ذمہ داری ادا نہیں کروں گا

مسجد دارالسلام باغ جناح لاہور میں بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کے 27 دسمبر 2002ء کے خطاب جمعہ کی تلخیص

ازروئے قرآن حیاتِ انسانی کی عظیم ترین حقیقت حیاتِ اخروی ہے جبکہ حیاتِ انسانی کے لئے حیاتِ دنیوی کی حیثیت ایک امتحانی وقفہ کی سی ہے۔ جو شخص اس دنیا میں رہتے ہوئے آخرت کے امتحان کی تیاری کرے اس کے لئے دنیا کی یہ زندگی نہایت قیمتی ہے۔ جیسا کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ((الدنیا مزرعة الآخرة)) "دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔" آخرت کی تیاری کے اعتبار سے اس دنیاوی زندگی کا ایک ایک لمحہ قیمتی اور مفید ہے کیونکہ ان محدود لمحات کا آخرت میں ملنے والا اجر لامحدود ہے۔ لیکن اگر ہم آخرت کو بھول جائیں اور اس دنیا میں کھو جائیں تو یہی دنیا ہمارے لئے سب سے بڑا دجل (دھوکہ) ہے۔

اب آیئے اس پہلو کی طرف کہ حیاتِ دنیوی کی سب سے بڑی حقیقت کیا ہے؟ حیاتِ دنیوی کی عظیم ترین حقیقت موت ہے۔ جیسا کہ سورۃ العنکبوت میں ہے:

﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ﴾

"ہر زندہ چیز نے موت کا مزہ چکھنا ہے"۔

موت وہ حقیقت ہے جسے کوئی جھٹلا نہیں سکتا۔ لیکن افسوس کہ ہم اس سب سے بڑی حقیقت کو جان بوجھ کر اپنے ذہن سے دور رکھتے ہیں اور دنیا کے کھیل تماشے میں مصروف رہتے ہیں۔ ہم یہاں بڑی بڑی عمارتوں کی تعمیر اس طرح کرتے ہیں، جیسے ہمیشہ یہیں رہنا ہے۔ حالانکہ حضور ﷺ نے فرمایا: "برا ہے وہ پیسہ جو اینٹ، گارے پر صرف ہوتا ہے"۔ یہ صرف اس وجہ سے ہوتا ہے کہ آدمی کو موت یاد نہیں رہتی۔ اگر موت کا تصور مستحضر ہو گا تو دنیا سے دل لازماً اچاٹ ہو گا۔ لیکن موت کا تصور محو ہو جائے تو دنیا کی حرص کبھی ختم نہیں ہوتی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: "انسان کی حرص کو صرف قبر کی مٹی ہی بھر سکتی ہے"۔

موت سے پہلے کی ایک کیفیت دو مقامات پر قرآن مجید میں بیان ہوئی ہے، جسے ارذل العمر کہا جاتا ہے۔ اس عمر سے حضور ﷺ نے بھی پناہ طلب فرمائی ہے۔ یہ بڑھاپے کی وہ عمر ہوتی ہے جب یادداشت ختم ہو جاتی ہے اور آدمی اپنے پیاروں کو بھی نہیں پہچان پاتا۔ سورۃ النحل میں اس کیفیت کا ذکر ہے:

"اللہ نے تمہیں پیدا کیا پھر وہ تمہیں موت دیتا ہے اور تم میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو ارذل العمر تک پہنچا دیئے جاتے ہیں، پھر وہ ایسے ہو جاتے ہیں جیسے کچھ جانتے نہیں، بے شک اللہ سب جاننے والا اور قادر ہے۔" (النحل: ۷۰)

سورۃ الحج کی آیت ۵ میں بھی انسانی تخلیق کے مراحل گنواتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے انتہائی بڑھاپے کی اس عمر کو انہی الفاظ یعنی ارذل العمر (بدترین عمر) سے تعبیر فرمایا ہے۔

ارذل العمر کا تجربہ ہر انسان کو خود تو نہیں ہوتا البتہ سورۂ یٰسین میں انسانی زندگی کی ایک اور حقیقت کا تذکرہ ہے۔ جو ہم میں سے بہت سے لوگوں پر وارد ہوئی ہو گی: ﴿ومن نعمره ننكسه في الخلق﴾ یعنی حیاتِ دنیوی کی ایک بڑی حقیقت یہ بھی ہے کہ عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ قوائے انسانی کمزور ہوتے چلے جاتے ہیں اور اس کی خلقی قوتوں میں کمی آ جاتی ہے۔ مثلاً عمر گزرنے کے ساتھ ساتھ یادداشت، بصارت اور سماعت میں کمی وغیرہ کا ہونا بہت سے افراد کے تجربے میں آیا ہو گا۔ اسی لئے دنیا میں ریٹائرمنٹ کا تصور ہے کہ عمر کی ایک حد کے بعد ملازم کو ریٹائر کر دیا جاتا ہے کہ اب اس کی صلاحیتوں میں کمی آنا شروع ہو جاتی ہے۔

دراصل یہ ساری تمہید میں نے اپنے ذاتی حوالے سے باندھی ہے۔ یعنی میرے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جوں جوں میری عمر میں اضافہ ہوا، جسمانی عوارض نے مجھے جکڑنا شروع کیا۔ ان میں سب سے پہلے مجھے گھٹنے کی تکلیف ہوئی۔ 1985ء سے کمر کی تکلیف شروع ہوئی۔ اس کے علاوہ یادداشت میں کمی کا معاملہ بھی شروع ہو چکا ہے۔ جبکہ پچیس برس سے بلڈ پریشر کے عارضے میں مبتلا ہوں۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اب تک جو دین کی خدمت کی توفیق دی ہے اس پر میں اللہ کا شکر گزار ہوں۔ میں نہ سکہ بند عالم تھا نہ ہوں، نہ ہی میں پیشہ ور مولوی ہوں۔ دراصل اللہ نے اوائل عمری ہی سے قرآن سے ایک مناسبت قائم کر دی۔ ہوا یوں کہ میٹرک کے بعد ترجمان القرآن کے شمارے پڑھنے کو ملے جن کی بدولت گویا قرآن نے مجھے possess کر لیا۔ بعد ازاں میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ جمعہ کا خطاب ہی تعلیم بالغاں کا نظام ہے۔ لہٰذا منٹگمری میں سالہا سال اہلحدیث کی مسجد میں خطاب جمعہ کی ذمہ داری ادا کرتا رہا۔ پھر لاہور آیا تو مسجد خضریٰ میں دس برس خطاب جمعہ دیا لیکن مسجد کمیٹی سے اختلاف کے باعث میں نے وہاں سے خطابت چھوڑ دی اور فیصلہ کیا کہ کبھی مسجد میں خطاب جمعہ نہ دوں گا۔ لہٰذا مختلف گھروں اور مساجد میں میرے دروس کا سلسلہ جاری رہا۔ البتہ کرنل سلامت اللہ کی درخواست پر مسجد دارالسلام میں ۱۹۷۷ء سے اب تک ۲۵ سال سے خطاب جمعہ کی صورت میں اس مسجد کی خدمت کر رہا ہوں۔ پہلے میں یہاں کھڑا ہو کر اردو اور عربی خطبہ دیا کرتا تھا اور نماز جمعہ کی امامت کروایا کرتا تھا، پھر میرے گھٹنوں میں تکلیف ہوئی تو میں نے اردو خطاب بیٹھ کر اور عربی خطبہ و امامت کھڑے ہو کر جاری رکھی۔ جب تکلیف زیادہ بڑھی تو ایک وقت آیا کہ عربی خطبہ اور امامت عزیزم عاکف سعید کے حوالے کی اور بیٹھ کر اردو خطبہ دینے لگا اور اب تک یہی معاملہ ہے۔ تاہم اب میں نے اپنی مسلسل گرتی ہوئی صحت کے پیش نظر فیصلہ کیا ہے کہ میں آئندہ مسجد دارالسلام باغ جناح میں خطاب جمعہ کی ذمہ داری ادا نہیں کروں گا۔ اب خطاب جمعہ کے لئے میری جگہ عزیزم حافظ عاکف سعید کی خدمات مسجد دارالسلام کی انتظامیہ کو حاصل رہیں گی۔ تاہم اگر میری صحت نے ساتھ دیا تو گاہے بگاہے میں خود بھی خطاب جمعہ کے لئے آتا رہوں گا۔ ان شاء اللہ oo

دیا اقبال نے ہندی مسلمانوں کو سوز اپنا
یہ اک مرد تن آساں تھا، تن آسانوں کے کام آیا
اسی اقبال کی میں جستجو کرتا رہا برسوں
بڑی مدت کے بعد آخر وہ شاہیں زیر دام آیا

تنظیم اسلامی کا پیغام
نظام خلافت کا قیام

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں!

تجزیہ نگار کے نقطۂ نظر سے ادارہ کا کامل اتفاق ضروری نہیں

ابوالحسن

''میرے جیب میں تمام سکے کھوٹے ہیں'' قائداعظم نے یہ کہا تھا یا نہیں یہ بات یقیناً متنازعہ ہے البتہ وقت اور حالات نے ثابت کیا کہ نہ صرف اس عظیم قائد کی جیب کے سکے کھوٹے تھے بلکہ ارد گرد بکھرے ہوئے سکوں میں سے بھی شاید ہی کوئی سکہ کھرا اور سچا ثابت ہوا ہو۔ مسلم لیگ پاکستان کی ماں تھی چاہئے تو یہ تھا کہ ماں اس بچے کو آئین کا لبادہ اوڑھا کر بادِ مخالف سے محفوظ کرتی۔ انگریز کے نظام خصوصاً جاگیرداری کو زمین میں گہرا دفن کر کے نظریہ پاکستان جو پاکستان کی جڑ اور بنیاد تھا اور جو پاکستان کی وجہ جواز تھا اس کا دامن تھام کر سفر کا آغاز کیا جاتا۔ جمہوری روایات اور انتخابات کے انعقاد سے عوام پر اعتماد کا اظہار کیا جاتا۔ عوام کو محسوس ہوتا کہ بندوں سے آزاد ہو کر اللہ کی غلامی نصیب ہوئی ہے۔ عوام کے شب و روز میں بھی تبدیلی آتی لیکن اس ماں نے اقتدار و اختیار کی اندھی خواہش کی تکمیل کے لئے اور پیٹ کے دوزخ کو بھرنے کے لئے خود اپنے بچے کو نوچنا شروع کر دیا۔ الاٹمنٹ سے بدعنوانیوں کا آغاز ہوا' روٹ پرمٹ اور کوٹہ سسٹم سے ہوتا ہوا کرپشن کا کینسر اب تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہاں تک مار کر چکا ہے اور یہ بچہ لڑکپن اور جوانی کی منازل طے کئے بغیر بڑھاپے کے ضعف اور ناتوانی کا شکار ہو چکا ہے۔ جس سن کو لوگ بھرپور جوانی کا نام دیتے ہیں اس وقت اس کا ایک حصہ گل سڑ کر الگ ہو گیا۔ باقی حصوں کو بھی محبت یا کسی جذبہ نے نہیں جبر نے جوڑا ہوا ہے۔

سیاست دان ناکام ہوئے یا یوں کہہ لیں کہ حرام خوری کے بوجھ سے معذور ہوئے اور معزول کر دیئے گئے تو فوج آ گئی۔ اس ملک کی بدقسمتی ملاحظہ فرمائیں کہ اسے چار مرتبہ خود اپنی فوج نے فتح کیا اور ہر مرتبہ نئی اور انوکھی جمہوریت کو جنم دیا کبھی بنیادی جمہوریت کبھی غیر جماعتی جمہوریت اور کبھی حقیقی جمہوریت۔ ہر چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے عملاً کہا ''میں پاکستان ہوں'' جنرل ایوب خان پہلے دراندار تھے لہٰذا زیادہ دلیر اور نڈر تھے۔ خود ہی آئین سازی کی اور خود ہی صدر بن بیٹھے۔ فرد واحد کا بنا ہوا آئین اقتدار اور اختیار کے حوالہ سے فرد واحد کے گرد ہی گھومتا تھا۔ ہر فوجی آمر نے سیاست دانوں کو گالیاں دیں انہیں کرپٹ کہا انہیں جھوٹا اور ہارس ٹریڈنگ کا بیوپاری کہا انہیں پاکستان کی تباہی کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ پھر جب حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر خصوصاً بیرونی دباؤ سے نجات حاصل کرنے کے لئے اپنی پسندیدہ طرز کی جمہوریت بحال کی تو جو سیاست دان ساتھ مل گئے وہ پاک صاف ٹھہرے اور جنہوں نے مخالفت کی سارا کیچڑ ان پر لا دیا گیا۔ سیاسی اور سول دور میں اراکین اسمبلی ادھر سے ادھر پھدک جائیں تو ہارس ٹریڈنگ کو لعنت قرار دے کر انہیں برا بھلا کہو اور اگر کسی جرنیل کی عطا کردہ حقیقی جمہوریت میں یہ عمل دہرایا جائے تو ضمیر کی آواز کہلائے۔ لہٰذا وزدہ ہونے سے بچنا ہو یا نیب کی گرفت اور شکنجہ سے آزادی حاصل کرنا ہو تو ایسی سیاسی جماعت میں شامل ہو جاؤ جس پر وردی سایہ فگن ہو۔

رسم دنیا ہے کہ جب کسی پر ظلم ہوتا ہے تو وہ عدالت کی طرف رخ کرتا ہے لیکن اس بدنصیب ملک کی عدالتوں پر نظریہ ضرورت کا قبضہ ہے اور یہ نظریہ ضرورت اب نظریۂ مجبوری بنتا جا رہا ہے۔ مجبوری یہ ہے کہ گاڑی پر جھنڈا نہیں رہے گا' بنگلے پر گارڈ نہیں رہے گا' پشت پر چوبدار نہیں رہے گا اور بینک کا بیلنس قائم نہیں رہے گا۔ چرچل نے شاید غلط ہی کہا تھا جس قوم کو عدالتوں سے انصاف مہیا ہو رہا ہو اسے کوئی شکست نہیں دے سکتا۔ پاکستان کی عدالتیں کبھی کبھی کسی خاتون سے اجتماعی زیادتی پر از خود نوٹس تو لے لیتی ہیں لیکن ملک کی آبرو سے کھیلنے والوں کو کھلا چھوڑ رکھا ہے۔

بدترین رول دینی اور مذہبی جماعتوں نے ادا کیا ہے۔ وہ اس نعرہ کا ذکر تو بہت کرتے ہیں ''پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ'' لیکن اللہ کی حاکمیت کے نفاذ کے لئے کبھی سنجیدہ کوشش نہیں کی سچ تو یہ ہے کہ وہ بھی اپنا اللہ اقتدار اور کرسی کو بنا چکے ہیں۔ انہوں نے بحالی جمہوریت کے لئے اتحاد قائم کئے' عوامی تحریکیں چلائیں' کامیاب بھی رہے لیکن خالصتاً نفاذ اسلام کے حوالہ سے وہ نہ کبھی متحد ہوئے اور نہ ہی کوئی عوامی تحریک اٹھائی گئی۔ ہاں البتہ سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے اسلام کا نعرہ خوب لگایا اور عوامی تحریک کی کامیابی کے لئے نظام مصطفیٰ کا لیبل لگایا۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ نظام مصطفیٰ کی تحریک میں جلسے اور جلوسوں کے دوران نماز کی امامت پر جھگڑے ہوئے اور ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھنے سے گریز کیا گیا۔ ایک سیکولر جماعت کی خاتون کو مسجد شہداء کے منبر پر بٹھا دیا گیا اور سیاسی مقصد کے حاصل ہوتے ہی نظام مصطفیٰ تحریک ٹھپ کر دی گئی۔ ماضی میں دینی جماعتیں الگ الگ انتخابات میں حصہ لیتی تھیں ہر جماعت اپنا اسلام پیش کرتی جس سے فرقہ وارانہ منافرت پیدا ہوئی اور بعد ازاں اس منافرت نے ایسے اژدہا کو جنم دیا جس نے مساجد کی حرمت بھی ہڑپ کر لی اور لوگ سٹین گنوں اور مشین گنوں کے سائے میں نماز پڑھنے پر مجبور ہوئے۔ بالآخر مجلس عمل کی صورت میں اتحاد قائم ہوا تا کہ انتخابات میں کامیابی حاصل ہو سکے۔ عوام نے ساتھ دیا اور اسمبلی میں مناسب نشستیں حاصل ہو گئیں تو دینی جماعتوں کے قائدین نے وزارت عظمیٰ کی خاطر سیکولر جماعتوں کے حضور حاضری دی۔ یورپ اور امریکہ کے سفراء کو اکٹھا کر کے معذرت خواہانہ رویہ اختیار کیا۔ مخلوط تعلیم اور حجاب کے بارے میں پکار پکار کر لچک کا اظہار کیا۔ طالبان سے لاتعلقی کے اعلان کئے گئے لیکن اقتدار کا ہما پھر بھی سر پر نہ بیٹھا۔

قوم پر ظلم و ستم ڈھانے میں بیوروکریسی بھی کسی سے پیچھے نہ رہی اقتدار پر اپنے پنجے گاڑھنے کے لئے غلام محمد اور غلام اسحاق جیسے لوگ ایوان صدر میں گھسا دیئے جنہوں نے اقتدار کو ذاتی جاگیر سمجھا وہ اسمبلیاں توڑنے کے شغل میں مصروف رہے اور ایسے افراد کو وزیر اور مشیر مقرر کیا جن کے بارے میں بعد ازاں معلوم ہوا کہ وہ دشمن ملک کی ایجنسی کے پے رول پر تھے۔ آہ کس کس کا گلہ کریں اور کس کس کی شکایت کریں بقول جنرل ضیاء الحق آوے کا آوے ہی بگڑا ہوا ہے اور بقول غالب ع

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں!

دعائے مغفرت کی اپیل

(1) حلقہ پنجاب شمالی کے بزرگ رفیق تنظیم بریگیڈیئر (ر) ارشاد اللہ خان انتقال فرما گئے ہیں۔

(2) اسلام آباد کے سینئر رفیق تنظیم عظمت ممتاز ثاقب کے والد محترم گزشتہ دنوں انتقال فرما گئے ہیں۔ رفقاء و احباب سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔ اللھم اغفرلھما وارحمھما وادخلھما فی رحمتک وحاسبھما حسابا یسیرا

قصوروار کون؟

''اُمت مسلمہ کی زبوں حالی کے ذمہ دار علمائے کرام ہیں یا جدید علوم کا علمبردار طبقہ؟'' اس سوال کا جواب مولانا زاہد الراشدی کی ایک تقریر کے درج ذیل اقتباس میں انتہائی اختصار اور عمدگی کے ساتھ دیا گیا ہے' جو روزنامہ جنگ میں 27 دسمبر 2002ء کو جناب عطاء الحق قاسمی کے کالم میں شائع ہوئی۔

سائنس اور ٹیکنالوجی میں پیچھے رہ جانے کی وجہ سے آج ہم دنیا میں اپنے جائز مقام سے محروم ہیں اور ہمارے مصائب و آلام کی ایک بڑی وجہ یہ ہے۔ صرف ایک مثال سے بات سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ نے آج سے پون صدی یا ایک صدی قبل ہم مسلمانوں کو بہت بڑی دولت سے نوازا۔ خلیج میں تیل کی دولت دی یہ ہمارا ادبار کا دور تھا' زوال کا دور تھا مگر اس دور میں بھی اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنے وقت کی سب سے بڑی دولت عطاء فرمائی۔ لیکن ہماری حالت یہ تھی کہ ہم تیل زمین سے نکالنے کی صلاحیت سے محروم تھے۔ چشمے کھودنے کی تکنیک سے بے بہرہ تھے۔ تیل نکال کر اسے ریفائن کرنے کی صلاحیت سے ہم کورے تھے اور تیل کو ریفائن کرنے کے بعد دنیا کی مارکیٹ میں بیچنے کے لئے مارکیٹنگ کی صلاحیت بھی ہم میں موجود نہیں تھی جس کی وجہ سے ہم مغربی ماہرین کو بلانے پر مجبور ہوئے۔ مغربی ماہرین آئے پھر مغربی کمپنیاں آئیں ان کے بعد بنک آئے پھر سیاست کار آئے اور اس کے ساتھ مغرب کی فوجیں بھی آ گئیں جو آج تیل کے چشموں کا گھیراڈالے بیٹھی ہیں۔ ذرا خیال کیجئے کہ تیل ہمارا' چشمے ہمارے' کنوئیں ہمارے' زمین ہماری لیکن ان پر قبضہ کس کا ہے؟ اور کس وجہ سے ہے؟ یہ ہماری نااہلی تھی کہ ہم تیل نکالنے' صاف کرنے اور عالمی مارکیٹ میں اسے بیچنے کی صلاحیت سے محروم تھے۔ جس کی وجہ سے مغرب سے ماہرین آئے اور آج ماہرین' کمپنیاں' بنک اور پھر فوجیں خلیج میں تسلط قائم کئے ہوئے ہیں۔ اس سے بڑا ظلم یہ ہے کہ تیل نکالنے صاف کرنے اور مارکیٹنگ کی صلاحیت آج بھی ہم میں موجود نہیں ہے اور مغرب کے ارادے یہ ہیں کہ ابھی امریکی وزارت دفاع پینٹاگون میں یہ دھمکی دی گئی ہے کہ اگر سعودی عرب نے امریکی احکامات کی من وعن تابعداری نہ کی تو اس کے تیل کے چشموں پر قبضہ کرلیا جائے گا اور مغربی ملکوں میں اس کے اثاثے اور مغربی بنکوں میں اس کے اکاؤنٹس ضبط کر لئے جائیں گے۔ اس لئے ہمیں اس کی تکلیف زیادہ ہے اور ہم اس کا درد زیادہ محسوس کر رہے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس کی ذمہ داری کس پر ہے؟ اس پر ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرنا چاہئے اور میں ہر اس شخص کو جس کے دل میں انصاف کی ایک رتی بھی موجود ہے اور ضمیر نام کی کوئی چیز وہ اپنے پاس رکھتا ہے دعوت دیتا ہوں کہ وہ سنجیدگی سے اس بات کا جائزہ لے کہ امت کی سائنس اور ٹیکنالوجی میں محرومی کا ذمہ دار کون ہے؟ میں تاریخ کے حوالہ سے بات کروں گا کہ 1857ء کے بعد انگریز حکمرانوں نے ہمارا پورا نظام تلپٹ

مولانا زاہد الراشدی

کر دیا تھا۔ دینی مدارس ختم کر دیئے تھے۔ نظام تعلیم کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا تھا اور ہر چیز الٹ پلٹ کر رکھ دی تھی۔ تب دو طبقے سامنے آئے تھے اور انہوں نے ملت کو سہارا دیا تھا دونوں نے الگ الگ شعبوں کی ذمہ داری قبول کی تھی۔ علماء کرام نے قرآن و سنت کی تعلیم باقی رکھنے کی ذمہ داری اپنے سر لی تھی اور اسلامی ثقافت اور تہذیب کے تحفظ کا وعدہ کیا تھا۔ انہوں نے اس مقصد کے لئے عوام سے تعاون کے لئے رجوع کیا' چندے مانگے' گھر گھر دستک دے کر روٹیاں مانگیں' زکوٰۃ اور صدقہ کے لئے دست سوال دراز کیا اور سرکاری تعاون سے بے نیاز ہو کر عوامی تعاون کے ساتھ قرآن و سنت کی تعلیم کو باقی رکھنے اور اسلامی تہذیب و ثقافت کے آثار کو بچانے کے لئے کردار ادا کیا۔ انہوں نے ایک ایک دروازے پر دستک دی' سر پر چنگیر رکھ کر گھر گھر سے روٹیاں مانگی ہیں۔ ہاں' ہاں میں نے خود روٹیاں مانگی ہیں اور مجھے اس پر فخر ہے کہ میں نے اپنے طالب علمی کے دور میں گوجرانوالہ کے کئی محلوں میں سر پر چھابہ رکھ کر گھر گھر سے روٹیاں مانگی ہیں۔ ہم نے اپنی عزت نفس کی پرواہ نہیں کی۔ طعنے سنے ہیں' بے عزتی برداشت کی ہے' لیکن قرآن و سنت کی تعلیم کو باقی رکھا ہے جس کی گواہی آج دشمن بھی دے رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور طبقہ سامنے آیا۔ جس نے قوم کو جدید علوم سے بہرہ ور کرنے کی ذمہ داری قبول کی۔ سائنس اور ٹیکنالوجی پڑھانے کا وعدہ کیا۔ انگریزی اور جدید زبانوں کی تعلیم اپنے ذمہ لی۔ انہیں اس کام کے لئے ریاستی مشینری کی مکمل پشت پناہی حاصل تھی اور انہوں نے قوم کے کھربوں روپے خرچ کر ڈالے۔ انہیں سرکاری وسائل میسر تھے' ریاستی پشت پناہی حاصل تھی لیکن وہ قوم کو سائنس اور ٹیکنالوجی میں آج کی قوموں کے برابر نہ لا سکے اور آج اپنی ناکامی کی ذمہ داری ''مولوی'' کے سر تھوپ کر اپنی نااہلی پر پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں آج کی اجتماعی دانش سے سوال کرتا ہوں کہ وہ انصاف سے کام لے اور یہ فیصلہ کرے کہ نااہل کون ثابت ہوا؟ اور اپنی ذمہ داری کس نے پوری نہیں کی؟ آج اگر ملک کے کسی گوشے میں دینی تعلیم کا انتظام نہیں ہے' قرآن و سنت کی رہنمائی لوگوں کو میسر نہیں ہے اور اسلام کی آواز نہیں لگ رہی تو ہم مجرم ہیں۔ لیکن سائنس اور ٹیکنالوجی میں دوسری قوموں سے پیچھے رہنے کی ذمہ داری ہم پر نہ ڈالیں۔ یہ ناانصافی ہے اس کے بارے میں ان سے پوچھئے جنہوں نے اس کی ذمہ داری قبول کی تھی اور اس کے لئے سرکاری خزانے کے کھربوں روپے اب تک انہوں نے خرچ کر ڈالے۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا آپ کو مساجد میں نماز پڑھانے کے لئے امام میسر ہیں؟ قرآن کریم کی تعلیم کے لئے قاری مل رہے ہیں؟ رمضان میں قرآن سنانے کے لئے حافظ مل جاتے ہیں؟ جمعہ پڑھانے کے لئے خطیب موجود ہیں؟ مسئلہ بتانے والے مفتی صاحبان کی کمی تو نہیں؟ دینی رہنمائی دینے کے لئے علماء کرام سے ملک کا کوئی گوشہ خالی تو نہیں؟ اس سے اگلی بات کہ جنگ میں کفر کے خلاف صف آرا ہونے والے مجاہدین بھی مدارس سے مل رہے ہیں یا نہیں؟ اگر یہ سب کچھ ہو رہا ہے تو دینی مدارس پر اعتراض کس بات کا ہے؟ میں کہتا ہوں کہ قومی کمیشن قائم کیجئے۔ ہمیں اور سرکاری تعلیم کے ذمہ داروں کو اس کے سامنے پیش کیجئے۔ ساری حقیقت کھل کر سامنے آ جائے گی۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔

ضرورت رشتہ

عمر 40 سال' تعلیم ایم اے' معقول ماہانہ آمدنی' ذاتی مکان' اوائل عمر سے اسلامی طرز معاشرت پر قائم مرد اولاد کی خواہش کی تکمیل کے لئے عقد ثانی کا خواہش مند ہے۔ پہلی بیوی کو کوئی اعتراض نہیں۔

برائے رابطہ: محمد افضل 40-9220137 (042)

مرحوم مشرقی پاکستان کی حدود میں قائم
بنگلہ دیش کے سیاسی حالات

یہ چند سطور ایک بنگلہ دیشی عالمِ دین کی طرف سے موصول ہوئی ہیں جن کی ذات قارئینِ ندائے خلافت کے لئے محتاج تعارف نہیں۔ موصوف کے رگ و پے میں اسلامی اخوت بھری ہوئی ہے۔ دردِ دل کی شدت کہیں کہیں تلخی کا روپ دھار لیتی ہے برصغیر کے مسلمانوں کی حالتِ زار پر آہیں بھرنے اور ذمہ داروں کا مرثیہ کہنے کے ساتھ ساتھ صحیح طرزِ عمل کی دعوت بھی دیتے ہیں۔ (ادارہ)

ہم پاکستانی اور بنگلہ دیشی ایک ہی آسمان کے ٹوٹے ہوئے ستارے ہیں۔ بلکہ یوں کہنا مناسب ہو گا کہ بنگالیوں ہی نے پاکستان کے حق میں سابق پاکستان کے قیام میں تمام صوبوں سے بڑھ کر زیادہ ووٹ ڈالے تھے۔ مگر یہ ساری جدوجہد صوبہ پنجاب کے نوزائیدہ سرمایہ داروں کی اور زمینداروں کی مفاد پرستی کی نظر ہوگئی ہے اور جنگ میں شکست خوردہ بے شرم فوجی جنرلوں نے بار بار اپنی ہی قوم کو بزور بازو فتح کر ڈالنے کی بزدلانہ حرکتیں کر کے پاکستان کی ماں جمہوریت کو ختم کر دیا۔ اور اب پاکستان کے باپ اسلام کو بیخ دین سے اکھاڑ پھینکنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ وجود پاکستان کسی فوجی جنرل کی قوت آزمائی کا کرشمہ نہ تھا بلکہ عامۃ المسلمین کے ووٹوں سے اور اسلام کی نظام حیات کے احیاء کے لئے پاکستان بنایا گیا تھا۔ پاکستان جنرلوں کی اور نوزائیدہ پنجابی سرمایہ داروں کی ملی بھگت کے نتیجہ میں پاکستان ٹوٹا ہے۔ اس علیحدگی میں عوام کا ہاتھ نہ تھا اور نہ ہی عوام یہ چاہتے تھے۔ مگر بزور بازو ناجائز طریقے سے اقتدار میں آنے والے جنرلوں' زمینداروں اور سرمایہ داروں کی ناعاقبت اندیش سیاست کاری کی پاداش میں ہم آج ''ٹوٹے ہوئے ستارے'' ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان خود فریب خوردہ دشمنانِ قوم وملت کی بے دانشی کے بدنتائج سے بچائے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ موجودہ فوجی راہنما پرویز مشرف صاحب نے ماضی قریب میں بنگلہ دیش کا دورہ کیا تھا۔ ان کا یہ دورہ ان کے امر آقاؤں کے اشارہ پر تھا۔ یہ صاحب جب بنگلہ دیش کے شہید منار کے دیدار کو تشریف لے گئے تو انہوں نے ماضی میں ان جیسے جنرلوں کے کارناموں کا بحیثیت جنرل ہونے کے یا از خود بزور بطور صدر پاکستان بننے کے' جرم کا اقرار نہیں کیا بلکہ تمام ذمہ داری (مغربی) پاکستان کے عوام کی طرف دھکیل دی اور Visitors Book میں تحریر فرمایا: ''پاکستان کے عوام یہاں کے عوام پر ڈھائے گئے ماضی کے مظالم پر اظہارِ ہمدردی اور افسوس کا اظہار کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ''۔ گویا عوام نے مظالم ڈھائے جس پر (مغربی) پاکستان کے عوام اب اظہارِ افسوس کرتے ہیں۔ باقی رہے فوجی ظالم جنرل تو وہ تو جنرل پرویز مشرف کے طاق نسیان میں رہے۔ اصل مجرموں کو پس پردہ رکھ کر پاکستانی عوام کو معذرت خواہ بنا دیا گیا۔ حالانکہ پاکستان کے طول وعرض کا سفر کیجئے' بنگلہ دیش کا سفر کیجئے' تو آپ پر ظاہر ہو گا کہ دونوں ملک کے باشندے حسبِ سابق اب بھی ''بھائی بھائی'' ہیں اور ان فوجی جرنیلوں کے کرتوت سے ناخوش ہیں۔ آخر مغربی پاکستان کے عوام نے تو مشرقی پاکستان کے عوام پر ظلم و زیادتی نہیں کی تھیں۔ جرم اگر ہے تو بھٹو مرحوم اور فوجی جنرلوں کا ہے نہ کہ عوام کا۔ بھٹو صاحب مغربی پاکستان کے بڑے زمیندار تھے۔ وہ مغربی پاکستان کے زمینداروں اور سرمایہ داروں اور وڈیروں کے نمائندہ تھے۔ اور فوجی جنرل لوگ امریکا کے اشارے پر پاکستان کے اقتدار پر قابض ہوئے۔ یہ لوگ امریکا کے ایجنٹ تھے اور اب بھی ہیں۔ یہ سب مجرم لوگ ہیں۔ ان کے جرم میں مغربی پاکستان کے عوام یا عام فوجی لوگوں کا عمل دخل نہ تھا' عام فوجی تو حکم کے بندے ہوتے ہیں' پالیسی میکرز نہیں ہوتے۔ عوام کو پس پشت ڈال کر فوجی جرنیل اقتدار پر ناجائز قبضہ جمائے ہوئے تھے اور نہتے عوام کے کندھوں پر بندر ناچ ناچ رہے تھے۔ لہٰذا ملک کی علیحدگی کے لئے صرف اور صرف یہ دو طبقے ذمہ دار ہیں' یعنی فوجی جرنیل اور مغربی پاکستان کے زمیندار اور سرمایہ دار۔ اس لئے عام فوجی سپاہیوں اور عوام الناس پر ذمہ داری نہیں ڈالی جاسکتی۔ علامہ اقبال مرحوم نے فرمایا تھا:

مکر کی چالوں سے بازی لے گئے سرمایہ دار
انتہائی سادگی سے کھا گئے مزدور مات

اور ہماری گفتگو میں ''سرمایہ دار'' کی جگہ زمیندار اور نو پیدا شدہ پاکستانی سرمایہ دار لوگوں کو رکھ کر سوچیں اور پاکستانی جنگ زادہ یا جنگ مارگزیدہ جنرل لوگوں کو رکھ لیں تو صورتِ حال زیادہ واضح ہو جائے گی۔ اس جنگ اقتدار میں عوام مار کھا گئے ہیں اور فوجی جنرل اور زمیندار سرمایہ دار مکر کی چالوں سے بازی جیت گئے ہیں اور عوام لوگ مار کھا گئے یا ہار گئے۔

اس کے علاوہ ہندو سیاست کے آگے ہم مار کھاتے چلے آرہے ہیں۔ ہمارے یہاں کے مسلم سرمایہ داروں نے خیال کیا تھا کہ متحدہ ہندوستان میں ہندو سرمایہ داروں کے مقابلے میں ٹھہرنا دشوار ہوگا۔ اگر پاکستان بن گیا تو ہم وہاں ''انا ولا غیری'' کا مقام پیدا کر لیں گے اور دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹتے چلے جائیں گے۔ لیکن ہندو سیاست باز شاطروں نے ہمارے سرمایہ دار طبقے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہونے دیا۔ انہوں نے ملک کے مشرقی بازو میں مغربی بازو کے سرمایہ داروں کی استحصال زر کی تجارتی مہم کو ناکام بنانے کا تہیہ کر لیا اور مظلوم مشرقی پاکستان کے لوگوں کی ''محرومی'' کو پونجی بنا کر ایسی چال چلی کہ ''الامان والحفیظ'' کی صدا بلند ہوگئی' پاکستانی سرمایہ داروں کے محل خانے میں' نتیجے میں ملک دو ٹکڑے ہو گیا اور سرمایہ لوٹنے کے سارے ہتھکنڈے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ بجائے پنجابی نوزائیدہ سرمایہ داروں کے' ہندو مارواڑی بنئے مال دار اور خوشحال ہو گئے۔ اور بنگلا دیش کو لوٹ کھسوٹ کا میدان بنا دیا۔ بنگلہ دیش فی الحال اسی مخمصہ میں گرفتار ہے۔ خدا کی قسم اس مخمصہ سے مسلم امہ کو کوئی مشرف نہیں بچا سکتا۔ اس کے لئے مسلم امہ کی متحدہ اسلامی طاقت ہی جمہوری قاعدہ پر عمل پیرا ہونے کے بعد یہ امت چھٹکارا پا سکتی ہے۔ یہاں بھی حضرت علامہ اقبال مرحوم کی بات یاد آتی ہے اور اس کے ساتھ ''تضمین'' کر کے بات موجودہ حالات سے ملائی جاسکتی ہے۔ تضمین:

مکر کی چالوں سے بازی لے گئے ہندو مدار
انتہائی سادگی سے کھا گئے مسلم مات

فی الحال بنگلہ دیش میں فوجی کارروائی سے امن وامان ہے۔ ڈر ہے اگر فوجی لوگوں کو سیاست کی چاٹ لگ گئی تو بنگلہ دیش بھی پاکستان کی طرح مشکلات کا شکار ہو جائے گا۔ امریکا یہاں بھی پاکستان کی طرح لشکری حکومت قائم کر کے اسلام کی راہ روکنے کی فکر میں ہے۔ آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا؟

مولانا ثمیر الدین' بنگلہ دیش

حضرت مجدّد الف ثانیؒ کا زمانہ

سید قاسم محمود

اکبر کا دینِ الٰہی ـــ (گزشتہ سے پیوستہ)

اسلام کے معاملے میں تو بادشاہ اور درباریوں کی ایک ایک حرکت سے ظاہر ہوتا تھا کہ اُن کو اسلام سے ضد اور چڑ ہو گئی ہے۔ اسلامی تعلیمات کے خلاف دوسرے مذاہب والوں کی طرف سے جو بات دربار کا رنگ دیکھ کر فلسفیانہ و صوفیانہ انداز میں پیش کر دی جاتی' اُسے وحی آسمانی سمجھ لیا جاتا اور اس کے مقابلے میں اسلامی تعلیم رد کر دی جاتی۔ علماء اسلام اگر اسلام کی طرف سے کوئی بات کہتے یا کسی گمراہی کی مخالفت کرتے تو انہیں ''فقیہ'' کے نام سے موسوم کیا جاتا' جس کے معنی اُن کی اصطلاحِ خاص میں احمق اور ناقابلِ التفات آدمی کے ہو گئے تھے۔ چالیس آدمیوں کی ایک کمیٹی مذاہب کی تحقیق کے لئے مقرر کی گئی تھی' جس میں تمام مذاہب کا مطالعہ بڑی رواداری' بلکہ عقیدت مندی کے ساتھ کیا جاتا تھا' مگر اسلام کا نام آتے ہی اُس کا مذاق اڑایا جانے لگتا تھا' اور اگر اسلام کا کوئی حامی جواب دینا چاہتا تو اُس کی زبان بند کر دی جاتی تھی۔ یہ برتاؤ اسی حد تک نہ رہا' بلکہ عملاً اسلام کے احکام کی دل کھول کر ترمیم و تنسیخ کی گئی۔ سود' جوئے اور شراب کو حلال کیا گیا۔ شاہی مجلس میں نوروز کے موقع پر شراب کا استعمال ضروری تھا' حتیٰ کہ قاضی و مفتی تک پی جاتے تھے۔ ڈاڑھی منڈوانے کا فیشن عام کیا گیا اور اس کے جواز پر دلائل قائم کئے گئے۔ چچا زاد اور ماموں زاد بہن سے نکاح کو ممنوع قرار دیا گیا۔ لڑکے کے لئے سولہ سال اور لڑکی کے لئے چودہ سال عمر نکاح مقرر کی گئی۔ ایک بیوی سے زیادہ بیویاں رکھنے کی ممانعت کی گئی۔ ریشم اور سونے کے استعمال کو حلال کیا گیا۔ شیر اور بھیڑیئے کو حلال کیا گیا۔ سؤر کو اسلام کی ضد میں نہ صرف پاک بلکہ ایک مقدس جانور قرار دیا گیا۔ حتیٰ کہ صبح آنکھ کھولتے ہی اسے دیکھنا مبارک خیال کیا جاتا تھا۔ مُردوں کو دفن کرنے کے بجائے جلانا یا پانی میں بہانا احسن ٹھہرایا گیا۔ اور اگر کوئی دفن ہی کرنا چاہے تو سفارش کی گئی کہ پاؤں قبلے کی طرف رکھے جائیں۔ اکبر خود اسلام کی ضد میں قبلے ہی کی طرف پاؤں کر کے سونے کا التزام کرتا تھا۔ حکومت کی تعلیمی پالیسی بھی سراسر اسلام کی مخالف تھی۔ عربی زبان کی تعلیم اور فقہ و حدیث کا درس ناپسندیدہ سمجھا جاتا اور جو لوگ یہ علوم حاصل کرتے' وہ حقیر خیال کئے جاتے۔ علومِ دینی کے بجائے حکمت و فلسفہ' ریاضی و تاریخ اور اس نوع کے علوم کو سرکاری سرپرستی حاصل تھی۔ زبان میں ہندیت پیدا کرنے کی طرف خاص میلان تھا اور عربی حروف کو زبان سے خارج کرنے کی بھی تجویزیں تھیں۔ ان حالات کی وجہ سے دینی مدرسے ویران ہونے لگے اور اکثر اہلِ علم ملک چھوڑ چھوڑ کر نکلنے لگے۔

> اکبر کے دینِ الٰہی میں نسلی اور طبقاتی امتیازات' اوہام و خرافات' نو ایجاد رسومات کی ایک نئی شریعت کے مخلوطے کا نام ''اسلام تمدن'' رکھ لیا گیا تھا۔

''یہ تو تھا حکومت کا حال۔ اور عوام کا حال یہ تھا کہ جو لوگ باہر سے آئے تھے' وہ ایران و خراسان کی اخلاقی و اعتقادی بیماریاں ساتھ لائے تھے' اور جو لوگ ہندوستان ہی میں مسلمان ہوئے تھے' اُن کی اسلامی تعلیم و تربیت کا کوئی خاص انتظام نہ تھا' اس لئے وہ پرانی جاہلیت کی بہت سی باتیں اپنے خیالات اور اپنی عملی زندگی میں لئے ہوئے تھے۔ ان دونوں قسم کے مسلمانوں نے مل جل کر ایک عجیب مرکب تیار کیا تھا' جس کا نام ''اسلامی تمدن'' تھا۔ اس میں شرک بھی تھا۔ نسلی اور طبقاتی امتیازات بھی تھے۔ اوہام و خرافات بھی تھے۔ اور نو ایجاد رسموں کی ایک نئی شریعت بھی تھی۔ دنیا پرست علماء و مشائخ نے نہ صرف اس مخلوطے سے موافقت کر لی تھی' بلکہ وہ اس نئے ''مت'' کے پروہت بن گئے تھے۔ لوگوں کی طرف سے ان کو نذرانے پہنچتے اور ان کی طرف سے لوگوں کو فرقہ بندی کا تحفہ ملتا۔

''پیرانِ طریقت کے ہاتھوں سے ایک اور بیماری پھیل رہی تھی۔ اشراقیت' رواقیت' مانویت اور ویدانیت کی آمیزش سے ایک عجیب قسم کا فلسفیانہ تصوف پیدا ہو گیا تھا جسے اسلام کے اعتقادی و اخلاقی نظام میں ٹھونس دیا گیا تھا۔ طریقت و حقیقت' شرع اسلامی سے الگ اور اس سے بے نیاز قرار دی گئی تھیں۔ باطن کا کوچہ ظاہر سے جدا بنا لیا گیا تھا اور اس کوچے کا قانون یہ تھا کہ حدودِ حلال و حرام رخصت' احکامِ دین عملاً منسوخ' اور ہوائے نفس کے ہاتھ میں کلی اختیارات۔ جس فرض کو چاہے' ساقط کرے اور جس چیز کو چاہے' فرض بلکہ فرض الفرض بنا دے۔ جس حلال کو چاہے حرام کر دے اور جس حرام کو چاہے حلال کر دے۔ ان عام پیروں سے بہتر جن کی حالت تھی' ان پر کم و بیش فلسفیانہ تصوف کے اثرات پڑے ہوئے تھے اور وحدت الوجود کے ایک غلط تصور نے خصوصیت کے ساتھ تمام قوائے عمل کو بے کار کر دیا تھا''۔

یہ حالات تھے' جب اکبری سلطنت کے ابتدائی ایام میں شیخ احمد سرہندی (1563ء-1624ء) پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم و تربیت ایسے لوگوں میں ہوئی تھی جو اُس دور کے صالح ترین لوگ تھے۔ خصوصیت کے ساتھ شیخ کو سب سے زیادہ فیض حضرت باقی باللہ سے پہنچا تھا۔ جب حضرت کے ساتھ راہ و رسم کی ابتداء ہوئی تھی' اسی وقت انہوں نے شیخ کے متعلق اپنے ایک دوست کو لکھا تھا: ''حال میں سرہند سے ایک شخص شیخ احمد نامی آیا ہے۔ نہایت ذی علم ہے۔ بڑی عملی طاقت رکھتا ہے۔ چند روز فقیر کے ساتھ ہی اُس کی نشست و برخاست ہوئی ہے۔ اِس دوران میں اُس کے حالات کا جو مشاہدہ ہوا' اُس کی بنا پر توقع ہے کہ آگے چل کر یہ ایک چراغ ہوگا جو دنیا کو روشن کر دے گا''۔

> اُس دور میں باطن کا کوچہ شرعِ اسلامی سے بے نیاز تھا۔ یہاں حدودِ حلال و حرام رخصت' احکامِ دین عملاً منسوخ اور ہوائے نفس کے ہاتھ میں کُلّی اختیارات تھے

آگے چل کر' تین سو سال بعد شیخ کے ایک عقیدت مند مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے ''تذکرہ'' میں شیخ سرہندی کو ہدیۂ عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا: ''دعوت کا مقام دوسرا ہے اور ''عزیمت دعوت'' کا دوسرا۔ ضرور نہیں کہ ہر رہرو کی یہاں تک رسائی ہو۔ عہدِ ظہورِ دعوت میں ہزاروں اصحاب علم و کمال موجود ہوتے ہیں مگر دروازے کا کھولنے والا صرف مجدد العصر ہی ہوتا ہے' اور اُس کے ظہور کے لئے ضروری نہیں کہ عامۂ اصحاب علم و حق بکلی معدوم ہو گئے ہوں۔ خود ہندوستان ہی کی تاریخ دیکھ لو' ہمیشہ ایسا ہی معاملہ نظر آئے گا۔ اکبر کے عہد کے اختتام اور عہدِ جہانگیری کے

اوائل میں کیا ہندوستان علماء و مشائخ حق سے بالکل خالی ہو گیا تھا؟ کیسے کیسے اکابر موجود تھے' لیکن مفاسدِ وقت کی اصلاح و تجدید کا معاملہ کسی سے بھی بن نہ آیا۔ صرف حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کا وجودِ گرامی ہی تن تنہا اس کاروبار کا کفیل ہوا''۔

اپنے ممدوح کو تن تنہا کاروبار کا کفیل قرار دیتے ہوئے ضروری تھا کہ اُس کے ہم عصروں کے اوصاف کا رنگ کسی قدر پھیکا کیا جائے۔ چنانچہ مولانا آزاد مزید لکھتے ہیں:

''معلوم ہے کہ اُس عہد میں بڑے بڑے علماء و اصحاب خانقاہ موجود تھے۔ معلوم ہوتا ہے' ہندوستان میں بجز عالموں اور پیروں کے کوئی نہیں بستا۔ کوئی شہر و قریہ نہ تھا کہ خانقاہوں اور مدرسوں سے خالی ہو۔ علماء میں شیخ وجیہہ گجراتی' شیخ علی متقی' شیخ جلال تھانیسری' ملا محمود جونپوری' مولانا یعقوب کشمیری' ملا قطب الدین سہالوی' شیخ عبدالحق محدث' ملا عبدالحکیم سیالکوٹی' مولانا الہداد جونپوری وغیرہم اپنے وقتوں کے مالک اور علم و تعلم کے بادشاہ تھے۔ بایں ہمہ دوسرے دوسرے گوشوں اور کاموں میں وقت بسر کر گئے۔ اس راہ میں تو ایک قدم بھی نہ اٹھ سکا۔ جو حالت اُس وقت نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام کابل و ترکستان و خراسان کی ہو رہی تھی' اُن سب کے سامنے تھی۔ سب اُس پر آہ و فغان بھی کرتے ہیں' مگر اس کے آگے معاملہ نہیں بڑھتا''۔

علماء حق کی آزمائش

اس بارے میں مولانا مودودی لکھتے ہیں: ''اُس دور میں ایسے صالح ترین لوگ موجود تھے' جو اگرچہ اپنے گرد و پیش کے فساد کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے' مگر کم از کم اپنے ایمان اور عمل کو بچائے ہوئے تھے اور جہاں تک ہو سکتا تھا' دوسروں کی اصلاح بھی کر رہے تھے''۔

میاں محمد افضل اپنی تالیف (اعلائے کلمۃ الحق کی روایت اسلام میں) کے صفحہ 221 پر رقم طراز ہیں: ''اکبر نصف صدی پر مشتمل اپنی حکمرانی کے عرصے میں اسلام کی عمارت کو زمین بوس کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ ایک جابر اور نشۂ اقتدار میں بدمست اور گمراہ جابر و قاہر بادشاہ کی پالیسیوں کے خلاف حق کی آواز بلند کرنا آسان نہ تھا اور جن چند بزرگوں نے کلمۂ حق بلند کرنے کی کوشش کی' وہ واقعی جان سے کھیل گئے..... اسلام کا یہ ایک دائمی اور زندہ معجزہ ہے کہ سخت سے سخت جابر حکمران کے دور میں بھی کلمۂ حق کہنے والے پیدا ہوتے رہے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا اور فاسق و فاجر اور ظالم حکمرانوں کے سامنے تمام زبانیں خاموش رہتیں تو اسلام میں بہت بڑا رخنہ پیدا ہو جاتا اور دینِ حق میں بگاڑ کو روکنا محال ہوتا۔ چنانچہ دورِ اکبری میں بھی چند حضرات ایسے اٹھے جنہوں نے جان ہتھیلی پر رکھ کر حق بات کہی''۔

مثلاً صدر الدور شیخ عبدالنبی' انہوں نے ابتدا میں شیخ مبارک (ابوالفضل کے والد اور فساد کے جڑ) کی تیار کردہ اُس ''محضر'' پر دیگر علمائے سو کے ساتھ دستخط ثبت کئے تھے جس میں بادشاہ کو ''مجتہد'' قرار دیا گیا تھا۔ تاہم بعد ازاں شیخ عبدالنبی نے بادشاہ کی کفر نواز اور الحاد پرستی (سیکولرازم) کی پالیسی سے کھلم کھلا اختلاف کیا۔ وہ عبدالقدوس گنگوہی کے پوتے تھے۔ یہ وہ شیخ عبدالقدوس گنگوہی ہیں' جنہوں نے اکبر کے والد بادشاہ ہمایوں کی اس بنا پر مخالفت کی تھی کہ ''ہمایوں بادشاہ اسلام کو تباہ کرتا ہے اور کفر و اسلام کے مابین فرق نہیں کرتا''۔ انہی بزرگ کے خلفاء میں حضرت مجدد الف ثانی کے والد شیخ عبدالاحد بھی تھے۔ صدر الصدور شیخ عبدالنبی اگرچہ دربار سے وابستہ تھے' لیکن دنیا پرست بالکل نہ تھے۔ نہایت نیک' پارسا اور تقویٰ و پرہیزگاری میں فرد تھے۔ (روضۂ کوثر)

اکبر عنفوانِ شباب میں علماء کا معتقد تھا۔ شیخ عبدالنبی کا اس قدر ادب کرتا تھا کہ ایک دفعہ اُن کے جوتے اٹھا کر اُن

> **اسلام کا یہ ایک دائمی اور زندہ معجزہ ہے کہ سخت سے سخت جابر حکمران کے دور میں بھی کلمۂ حق کہنے والے پیدا ہوتے رہے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اسلام میں بہت بڑا رخنہ پیدا ہو جاتا اور دینِ حق میں بگاڑ کو روکنا محال ہوتا۔**

کے سامنے رکھے۔ بعد میں جب اکبر پر ہندوانہ رنگ چڑھنے لگا تب بھی شیخ اُس کی توجہ شرع اسلامی کے رنگ کی طرف دلاتے رہے۔ ایک دفعہ بادشاہ اپنی سالگرہ کی تقریب میں بسنتی رنگ میں رنگے کپڑے پہن کر آیا تو شیخ عبدالنبی نے بادشاہ کو سب کے سامنے ٹوک دیا۔ شیخ کے ہاتھ میں عصا تھا۔ انہوں نے ٹوکتے ہوئے عصا کو بادشاہ کی طرف حرکت دی اور عصا کا سرا بادشاہ کو لگا۔ اُس وقت تو اکبر سب کے سامنے خاموش ہو گیا لیکن دل میں بہت برا محسوس کیا۔

حالات نے ایسا رُخ اختیار کیا کہ بادشاہ اور شیخ کے درمیان تصادم ناگزیر ہو گیا۔ اُس کی فوری وجہ متھرا میں توہین رسالت کا واقعہ ہوا۔ ہندوؤں کے حوصلے یہاں تک بڑھے کہ بانیٔ اسلام کی توہین کے واقعات شروع ہو گئے۔ متھرا میں مسلمانوں نے ایک نئی مسجد تعمیر کرنے کے لئے اینٹیں اور دوسرا تعمیراتی ساز و سامان جمع کیا کہ ایک بااثر برہمن نے اُس پر قبضہ کر کے اسے مندر کی تعمیر میں لگا دیا۔

جب مسلمانوں نے مزاحمت کی تو اُس نے پیغمبر اسلامؐ کو گالیاں دیں اور مسلمانوں کی سخت توہین کی۔ شاتم رسول کے خلاف بادشاہ کے پاس شکایت گئی' لیکن بادشاہ نے توہینِ رسالت کے مرتکب ہندو کے خلاف کارروائی عمل میں لانے سے عمداً گریز کیا۔ بادشاہ نے تو کچھ نہ کیا' لیکن مذہبی اُمور کے انچارج صدر الصدور شیخ عبدالنبی کے حکم اور فتویٰ پر اُس برہمن کو قتل کر دیا گیا۔ اس قتل پر اکبر نے شدید ردِعمل کا اظہار کیا' کیونکہ اس کی ہندو رانیوں نے برہمن کے قتل پر باقاعدہ سوگ منایا تھا اور اکبر کو طعنے دیئے تھے کہ وہ بادشاہ ہو کر بھی علما کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا۔ اکبر کو سخت تاؤ آیا اور چند ماہ بعد حج اور خیر خیرات کے کاموں کے بہانے صدر الصدور کو حجاز کی طرف بھیج دیا۔ یہ دراصل جلاوطنی تھی کیونکہ بادشاہ کی طرف سے یہ حکم بھی تھا کہ حجاز سے وہ بلا اجازت ہندوستان واپس نہ آئیں۔ شیخ عبدالنبی حجاز چلے گئے' حج ادا کیا' لیکن اگلے سال واپس آ گئے۔ اس پر انہیں بادشاہ کے حکم پر گرفتار کر لیا گیا۔ انہیں فتح پور سیکری میں بادشاہ کے سامنے گرفتاری کی حالت میں پیش کیا گیا۔ اکبر نے ان سے نہایت درشت لہجے میں گفتگو کی اور اُن کی اہانت کی۔ اس کے بعد بھرے دربار میں اُن کے منہ پر مکا مارا۔ شیخ نے اس موقع پر نہایت جرأت کے ساتھ بادشاہ کی سب باتوں کا جواب دیا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ انہیں قیدِ سخت میں ڈال دیا جائے۔ حکم شاہی کی تعمیل ہوئی۔ وہ دیر تک قید خانے میں رہے۔ اسی دوران میں انہیں بادشاہ کے حکم پر گلا دبا کر ختم کر دیا گیا۔

ایک اور بزرگ شیخ منور بنی اسرائیل اکبر کے عتاب کا نشانہ بنے۔ اُن کا تعلق پنجاب سے تھا۔ عہد اکبری میں پنجاب سے متعدد علما نے اسلام کے خلاف اکبری فتنوں کے خلاف آواز اٹھائی' جن کو مختلف قسم کی سزائیں دی گئیں۔ اکثر کو جلاوطن کیا گیا۔ شیخ منور لاہور میں مسند درس سنبھالے ہوئے تھے۔ بلند پایہ عالم تھے۔ فقہی احکام میں بہت سخت تھے۔ انہوں نے ایک کتاب لکھی جس میں علمائے سُو کے اس فتوے کی تردید کی گئی تھی کہ توہینِ رسالتؐ کے مجرم' شاتمِ رسول کو معافی دی جا سکتی ہے۔ وہ اسی بناء پر معتوب ٹھہرے۔ انہیں مسلسل پانچ سال تک گوالیار کے قلعے (عقوبت خانہ) میں قید رکھا گیا۔ ان کا قیمتی کتب خانہ جس میں ڈیڑھ ہزار کتابیں تھیں' بحق سرکار ضبط کر لیا گیا۔ قید سے رہائی کے بعد انہیں انتہائی عسرت اور پریشانی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا گیا۔

عہدِ اکبری میں سب سے زیادہ جرأت کا مظاہرہ جون پور کے ایک شیعہ عالم اور قاضی ملا محمد یزدی نے کیا۔ ملا یزدی نے جب بادشاہ کی بوالعجبیوں اور خرافات کا حال سنا تو کسی مصلحت کو خاطر میں لائے بغیر علی الاعلان یہ فتویٰ

جاری کیا کہ "بادشاہِ ہند جلال الدین اکبر گمراہ ہو چکا ہے اور اب اس کے خلاف جہاد واجب ہے"۔ ملا یزدی کی یہ حق گوئی صدا بہ صحرا ثابت ہوئی اور اکبر کی اسلام دشمنی کے خلاف علماء کے درمیان اتفاق رائے نہ ہو سکا۔ ایسا ہی ایک فتویٰ بنگال کے قاضی القضا معز الملک نے بھی جاری کیا۔ اکبر نے ان دونوں علماء کو بہانے سے بلایا۔ جب وہ آگرے سے دس کوس پر فیروز آباد میں پہنچے تو حکم دیا گیا کہ ان دونوں کو الگ کر کے دریائے جون کے راستے گوالیار پہنچا دو جہاں ملکی مجرموں کا جیل خانہ تھا۔ پھر حکم ہوا کہ ان کا خاتمہ کر دو۔ چنانچہ پہرے داروں نے انہیں ایک ٹوٹی کشتی میں ڈالا اور تھوڑی دور جا کر گرداب کی گود میں دفن کر دیا"۔ (رودِ کوثر)

اکبر نے تعدد ازدواج میں اسلامی احکام کو نظر انداز کر دیا تھا اور علمائے سُو سے اپنے لئے مُتعہ بھی جائز قرار دلوایا تھا۔ بنگال کے عالمِ دین قاضی یعقوب مانک پوری نے متعہ کے خلاف فتویٰ جاری کیا۔ اکبر نے انہیں گوالیار کے قید خانے میں قید کرنے کا حکم دیا۔ وہ بنگال سے گوالیار کی طرف گرفتاری کی حالت میں لائے جا رہے تھے کہ حکم ملا انہیں قتل کر دیا جائے۔ چنانچہ حق گوئی کی پاداش میں قاضی یعقوب کو رستے ہی میں عدم آباد کا رستہ دکھا دیا گیا۔ جس کسی نے بادشاہ کی مرضی کے خلاف فتویٰ دینے کی جرأت کی تو اُسے ٹھکانے لگا دیا گیا۔ امرائے دربار قطب الدین کو کہ اور شہباز خان کنبوہ نے دلیری کے ساتھ بادشاہ کو بہت سمجھانے کی کوشش کی۔ چونکہ دونوں نہایت بااثر امراء تھے اس لئے اکبر اُن پر غضبناک ہونے کے علاوہ کچھ نہ کر سکا۔

عہد اکبری کے حق گو علماء کی فہرست میں ایک نام شیخ عبدالقادر گیلانی اُوچی کا ہے۔ وہ مخدوم موسیٰ پاک شہید کے بھائی تھے (جن کا مزار ملتان میں پاک گیٹ کے اندر ایک احاطے میں ہے)۔ دونوں بھائی اکبر کے دربار میں رہے۔ سلسلہ قادریہ سے تعلق تھا۔ دونوں نے غیر شرعی امور میں بادشاہ کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ ایک دن بادشاہ نے انہیں محل کے پاس "عبادت خانے" میں فرض نماز کے بعد نوافل پڑھتے دیکھا تو کہا کہ آپ کو نوافل گھر جا کر پڑھنے چاہئیں۔ اس پر شیخ نے بادشاہ سے کہا: "یہ عبادت کی جگہ ہے اور یہاں آپ کی حکومت نہیں چلتی"۔ اس پر بادشاہ نے انہیں دارالحکومت اور دربار سے نکال دیا اور وہ اُچ جا کر لوگوں کے روحانی افادے میں مصروف ہو گئے۔ موسیٰ پاک شہید کے بارے میں مورخین لکھتے ہیں کہ وہ نماز کا وقت ہو جانے پر دیوان خانے میں جانماز بچھا کر عبادت میں مصروف ہو جاتے تھے اور بادشاہی رعب کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔

شیخ حسین اجمیری (متولی درگاہ اجمیر) بھی ایک ایسے ہی حق گو فرد تھے۔ ایک بار اکبر اجمیر گیا تو شیخ حسین بادشاہ کا استقبال وغیرہ کرنے کی بجائے اجمیر سے باہر چلے گئے۔ بادشاہ کو اُن کی اس حرکت پر سخت غصہ آیا اور عتاب کر کے اُنہیں درگاہ کی تولیت سے ہٹا دیا اور مکہ چلے جانے کا حکم دیا۔ شیخ حسین کچھ عرصے کے بعد حجاز سے واپس آئے لیکن دربار میں پہنچ کر "سجدۂ تعظیمی" نہیں کیا۔ اس پر اکبر پہلے سے بھی زیادہ ناراض ہوا اور سندھ میں بھکر کے قلعے میں محبوس کر دیا جہاں وہ کئی سال رہے۔ رہائی ملی تو دربار میں پہنچے لیکن آدابِ سلطانی بجا لانے سے احتراز کیا۔ علاوہ ازیں بادشاہ کا عطیہ قبول کرنے سے بھی انکار کیا۔ بادشاہ کا عتاب پھر نازل ہوا۔

شیخ فرید کا شمار اکبر اور جہانگیر کے بااثر امراء میں ہوتا ہے۔ شیخ فرید راسخ العقیدہ شخص تھے۔ سلسلۂ نقشبندیہ کے بزرگ حضرت خواجہ باقی باللہ اور اُن کے خلیفہ خاص حضرت مجدد الف ثانی سے روابط تھے۔ حالات کی نزاکت دیکھ کر بادشاہ اکبر کو راہِ راست پر لانے کی سعی لاحاصل کرنے کی بجائے شیخ فرید نے مناسب سمجھا کہ گمراہی، بدمذہبی اور لادینی کے جراثیم کو دربارِ سلطنت سے باہر پھیلنے سے روکا جائے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے خصوصاً حضرت مجدد کی ہدایات اور رہنمائی میں کام کیا۔ شیخ فرید بخاری سید تھے۔ اپنی ذہانت، شجاعت، دانائی اور سخاوت کی بنا پر دربارِ سلطنت میں بہت رسوخ رکھتے تھے اور میر منشی کے عہدے پر متمکن ہوئے تھے۔ جہانگیر نے انہیں "صاحبِ سیف و قلم" کا خطاب دیا تھا۔ نقشبندی بزرگوں کی اعانت کر کے شیخ فرید نے تجدید و احیائے اسلام کے لئے ناقابلِ فراموش خدمات سرانجام دیں، اسی لئے خواجہ باقی باللہ نے وصیت کی تھی کہ شیخ فرید کے حقوق کا اُن کے تمام مرید خاص خیال رکھا کریں۔

ملا واحدی اپنی کتاب "تاثرات" میں لکھتے ہیں: "شیخ فرید وہ امیر ہیں جنہیں شہنشاہ جلال الدین اکبر کے مرتے وقت تمام بااثر امراء نے اپنا نمائندہ بنا کر جہانگیر کے پاس بھیجا تھا کہ ہم آپ کی حمایت کے لئے تیار ہیں، مگر یہ فرمایئے کہ باپ کی طرح کوئی نیا دین تو کھڑا نہ کیجئے گا"۔

شہنشاہ جہانگیر کا دور آیا تو کچھ عرصہ تک عہدِ اکبری کے رسوم و طریقے رائج رہے۔ تاہم اسلام کی علانیہ مخالفت باقی نہیں رہی تھی۔ اس دور میں کچھ بزرگوں نے جان پر کھیل کر کلمۃ الحق بلند کیا۔ ان میں اہم ترین اور تاریخ ساز کردار شیخ احمد سرہندی، مجدد الف ثانی نے ادا کیا۔ (باقی آئندہ)

علامہ اقبال اور پردہ

ایک مرتبہ علامہ اقبالؒ کسی مغربی ملک میں بصورت وفد گئے۔ تمام ارکانِ وفد اپنی بیویوں سمیت جا رہے تھے۔ علامہ اقبال نے اس سے انکار کیا اور کہا ان کی بیوی پردے کی پابند ہیں اور ایسے وفدوں میں پردے کا ذکر تک نہیں آتا۔ (حکیم محمد حسین صاحب عرشی امرتسریؒ) ایک مرتبہ سر محمد شفیع کے ہاں علامہ صاحب مع فیملی مدعو تھے لیکن علامہ صاحب تنہا گئے۔ سر شفیع نے پوچھا، بیگم صاحبہ کو کیوں نہیں لائے؟ آپ نے جواب دیا کہ وہ پردے کی پابند ہیں۔ سر شفیع نے کہا، یہاں زنانے میں قیام فرما سکتی ہیں۔ علامہ صاحب نے جواب میں کہا، بے پردہ گھروں کے "زنانے" بھی ایسے ہی ہوتے ہیں۔

(پیرزادہ محمد بہاؤالحق قاسمی امرتسری، کتاب پردۂ نسواں صفحہ ۲۵) مرسلہ: مظہر علی ادیب

رفقاء توجہ فرمائیں

رفقاء و رفیقات تنظیم اسلامی سے گزارش ہے کہ ندائے خلافت میں اشاعت کے لئے اپنا مضمون، تحریر یا رپورٹ مرکزی شعبہ نشر و اشاعت دفتر تنظیم اسلامی 67۔اے، علامہ اقبال روڈ گڑھی شاہو لاہور کے پتہ پر ارسال فرمائیں۔ شکریہ

فون: 6366638-6316638، فیکس: 6305110، ای میل: markaz@tanzeem.org

المعلن: ڈاکٹر عبد الخالق، مرکزی ناظم نشر و اشاعت

''میرے زمانے کی دلّی''

مصنف: ملا واحدی

نئی کتاب کا تعارف

مدت سے آرزو تھی کہ یہ کتاب دیکھی اور پڑھی جائے۔ آرزو میں یہ شدت کچھ اس لئے بھی تھی کہ راقم کو عظیم مصنف سے اک نسبتِ خاص ہے۔ میرا لڑکپن' یوں سمجھو کہ پانچویں سے دسویں جماعت تک مُلّا واحدی دہلوی کے دفتر میں گزرا جو اُن کا گھر بھی تھا۔ مُلّا واحدی معمولی آدمی نہ تھے۔ ادب اور صحافت کے شعبوں میں' بالخصوص خدمتِ اسلام کی رعایت سے اُن کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ یہ الگ بات کہ قوم خود فراموشی کی کیفیت میں ہر ناقابلِ فراموش کو بھلائے چلی جا رہی ہے۔ اب ''ندائے خلافت'' کے ایک نادیدہ قاری (مقیم بہاولپور) نے یہ کتاب دوسرے قارئین کے استفادے کے لئے بھیجی ہے تو جی خوش ہو گیا۔

مُلّا واحدی (1888-1976ء) کا اصل نام محمد ارتضیٰ تھا۔ خواجہ حسن نظامی نے ملا واحدی کہا اور یہی اُن کی عرفیت بن گیا۔ اُن کا تعلق اُس قدیم خاندان سے ہے جو شاہجہاں کی دلّی آباد ہونے کے وقت بادشاہ کے خصوصی بلاوے پر بخارا سے آیا تھا۔ پندرہ برس کی عمر میں اخبارات و جرائد میں مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع کیا جن میں ماہنامہ زبان دہلی' ماہنامہ وکیل امرتسر' ہفتہ وار وطن لاہور اور روزنامہ پیسہ اخبار لاہور شامل ہیں۔ جولائی 1909ء میں خواجہ حسن نظامی نے رسالہ ''نظام المشائخ'' جاری کیا تو ملا واحدی کو نائب مدیر مقرر کیا۔ 1912ء میں خواجہ نظامی ''نظام المشائخ'' کی ملکیت سے دستبردار ہو گئے تو ملا واحدی نے رسالے کے ساتھ ساتھ کتابوں کی اشاعت کا کام بھی شروع کر دیا۔ اپنا پریس قائم کیا۔ مصورِ غم علامہ راشد الخیری اور دوسرے مصنفین سے کتابیں لکھوائیں اور اپنے پریس میں طبع کر کے اپنے کاروبار کو وسعت دی۔

قیامِ پاکستان کے بعد ملا واحدی ہجرت کر کے کراچی چلے آئے۔ یہاں سے جنوری 1948ء میں ''نظام المشائخ'' از سرِ نو جاری کیا' لیکن نامساعد حالات کے باعث 1960ء میں بند ہو گیا۔ تاہم اس کے بعد بھی ملا واحدی کی تحریر کا شغف جاری رہا۔ دلی کی زبان میں دلی اور دلی والوں کے بارے میں اُن کی تحریریں ملک کے موقر اخبارات و جرائد میں شائع ہوتی رہیں۔ پاکستان آنے کے بعد انہوں نے تین جلدوں میں ''حیاتِ سرورِ کائنات'' سوانح خواجہ حسن نظامی' سوانح اکبر الٰہ آبادی' تاثرات اور یہ کتاب ''میرے زمانے کی دلّی'' تصنیف کیں۔

اس کتاب ''میرے زمانے کی دلّی'' میں بیسویں صدی کے نصف اول کی دلی کے تمدن و معاشرت کی بہترین تصویر کشی کی گئی ہے۔ فاضل مصنف نے اپنے ہوش سنبھالنے سے لے کر قیامِ پاکستان تک کے واقعات و مشاہدات کو فطری انداز میں پیش کیا ہے۔ ان میں علماء و فضلاء' ادیبوں' شاعروں' سیاست دانوں اور تاجروں سے لے کر عوامی طبقے سے تعلق رکھنے والے کباب فروشوں' پتنگ بازوں' خوانچہ فروشوں اور دوسرے طبقوں کا دل آویز ذکر موجود ہے۔ ہم اس مضمون میں چند مشاہیر علماء کا ذکر' خلاصۂ مصنف کے اپنے الفاظ میں پیش کر رہے ہیں:

دورِ زوال کا بھکاری

لیکن پہلے دلّی کی اسلامی تہذیب کے دورِ زوال کا ایک واقعہ سن لیجئے جو ''شمس العلماء مولوی سید احمد' امام جامع مسجد اکثر سنایا کرتے تھے۔ کوئی فرنگی سیاح جامع مسجد دیکھنے آیا۔ اُس فرنگی نے بٹوا کھول کر بھیک مانگنے والے کو بھیک دی اور جامع مسجد میں چلا گیا' اور پھر جامع مسجد کے دوسرے دروازے سے نکل گیا۔ ہوٹل پہنچا تو بٹوا غائب تھا۔ بٹوے میں دس بارہ اشرفیاں تھیں۔ دو تین روز گزار کر فرنگی کا جی جامع مسجد کی سیر کو پھر چاہا۔ سیڑھیوں پر قدم رکھتے ہی ایک بھکاری نے آواز دی ''صاب صاب! یہ تمہارا بٹوا تو نہیں ہے۔ اُس روز یہاں گر پڑا تھا''۔ فرنگی نے بٹوا لے لیا۔ اشرفیاں گنی گئیں۔ پوری تھیں۔ فرنگی نے دو اشرفیاں بطور انعام بھکاری کو دینی چاہیں۔ بھکاری نے گردن ہلائی اور فرنگی کا ہاتھ روک دیا۔ فرنگی نے پوچھا' اور دوں؟ بھکاری نے کہا: نہیں' اور مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ فرنگی تعجب سے بولا' تم ایماندار بھی ہو اور مستغنی بھی ہو۔ بھکاری نے کہا' جی ایماندار اور مستغنی تو خیر کیا ہوں۔ بس اسے گوارا نہیں کر سکتا کہ میرے پیغمبر کا سر تمہارے پیغمبر کے سامنے نیچا ہو جائے۔ تمہارے پیغمبر نے کہیں چھیڑ دیا کہ آپ کے اُمتی نے میرے اُمتی کی اشرفیاں رکھ لیں یا آپ کے اُمتی نے میرے اُمتی سے اشرفیاں واپس کر دینے کا صلہ لے لیا تو میرے پیغمبر کو شرمندگی ہو گی۔ جایئے اشرفی لے جایئے..... ملاحظہ فرمایا' آپ نے دورِ زوال کے دلّی والے بھک منگے کا کریکٹر۔ آج شریف مسلمانوں کو بھی یہ خیال مشکل سے آتا ہو گا کہ ہماری حرکتیں ہمارے پیغمبر اور پیغمبر کی تعلیمات کی بابت کیا رائے قائم کرا رہی ہیں''۔

منشی ذکاء اللہ

منشی ذکاء اللہ میرے ہم محلّہ تھے (ملا واحدی کوچہ چیلان میں رہتے تھے)۔ میرے بزرگوں سے اُن کا میل جول تھا۔ میں نے ''نظام المشائخ'' جاری کیا تو انہوں نے اس کے واسطے تابڑ توڑ مضامین لکھے۔ میں اُن کی خدمت میں اکثر جایا کرتا تھا۔ اُن کی زندگی مشین جیسی تھی' بلکہ مشین رُک سکتی تھی' اُن کے مشاغل اور معمولات نہیں رکتے تھے۔ جس کام کا جو وقت مقرر کر لیا تھا' اُسے وہ مقررہ وقت پر ضرور انجام دیتے تھے۔ بے حد قاعدہ ضابطہ کے آدمی تھے۔ میں نے گھر سے باہر انہیں کبھی انگرکھا اور چغہ پہنے اور عمامہ باندھے بغیر نہیں دیکھا۔ گھر سے کوٹھی بالکل پاس تھی۔ مگر وہاں بھی آتے تو انگرکھا اور چغہ پہن کر اور عمامہ باندھ کر آتے۔ جوتی' لال نری کی دیسی استعمال کرتے تھے۔ انگریزی جوتا عمر بھر استعمال نہیں کیا۔

چھیاسی ستاسی سال عمر پائی۔ بسترِ مرگ پر پڑے پڑے روزانہ صبح' گزشتہ چوبیس گھنٹوں کی کیفیت لکھ لیتے تھے یا لکھوا لیتے تھے۔ جو مزاج پُرسی کے لئے جاتا' زبانی جواب دینے کی بجائے لکھی ہوئی سرگزشت اُس کے آگے سرکا دیتے تھے۔ اُسی زمانے میں ایک روز مجھ سے فرمایا' میں نے حساب لگایا ہے۔ تمام تصانیف اور مضامین اگر فل سکیپ کاغذ کے اوپر نقل کئے جائیں تو فل سکیپ کے دو لاکھ صفحوں میں آئیں گے۔ انتقال سے چند دن پہلے کمرے کی کھڑکی کے پاس پلنگ پر گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھے تھے۔ میں حاضرِ خدمت تھا۔ سامنے ایک ضعیف العمر شخص جاتا نظر آیا۔ بارہ تیرہ برس کی لڑکی اس کی چڈھی پر سوار تھی۔ فرمایا: ''دیکھو' یہ بڑا آدمی ہے۔ آج اس بچی کی ماں کو مرے ہوئے بارہ تیرہ برس گزر چکے۔ بچی پیدائشی مفلوج ہے۔ چل پھر نہیں سکتی۔ دماغ بھی ماؤف ہے' مگر بارہ تیرہ برس سے بڈھا اسے اٹھائے اٹھائے پھر رہا ہے۔ گو موت اور رال کے دریا بڈھے کے اوپر بہہ جاتے ہیں' لیکن بڈھا نہیں گھبراتا۔ اللہ کا خوف ہے یا بیٹی کی محبت یا مرنے والی بیوی سے وفاداری۔ بہرحال اس بوڑھے میں بڑی پاکیزہ روح کارفرما ہے۔ تم آئندہ نہ جانے کیسے کیسے بڑے آدمی دیکھو گے' مگر اِس نوعیت کے بڑے آدمی شاید اب نہ پیدا ہوں''۔

آل انڈیا مسلم لیڈر

دلی کے آل انڈیا مسلم لیڈر پانچوں کے پانچوں مولوی تھے۔ سمیع اللہ خاں سدا نواب مولوی سمیع اللہ خان کہلائے۔ مولانا حالی مولانا تھے ہی۔ ڈپٹی مولوی نذیر احمد مجید مولوی تھے۔ مولویت کا پیشہ اختیار کر لیتے تو دوسرے مولوی نذیر حسین (محدث) بن جاتے۔ سرسید احمد خان بانی علی گڑھ کالج اور مولانا محمد قاسم بانی مدرسہ دیوبند ایک دہلوی استاد مولوی مملوک علی کے شاگرد تھے۔ منشی ذکاء اللہ نے بھی قدیم نصاب کے سوا اور کچھ نہیں پڑھا تھا' مگر منشی ذکا اللہ پورے مولوی نہیں تھے۔ ان حضرات کے زمانے تک مولوی وہی کہلاتا تھا جو پورا مولوی ہوتا تھا۔ ذرا سی کسر رہ جاتی تھی تو اسے منشی کہتے تھے۔ منشی سے مطلب اردو کا کلرک (محرر) مت سمجھئے گا۔ منشی کے معنی ہیں انشا پرداز' صاحب قلم۔ منشی ذکاء اللہ نے اتنی تصنیفات اپنی یادگار چھوڑی ہیں کہ اتنی کتابیں آج کل کے لوگ اطمینان قلب کے ساتھ پڑھ بھی نہیں سکتے۔ اور مولوی نذیر احمد اور مولانا حالی نے تو اردو نثر و نظم میں ایک انقلاب عظیم رونما کر دیا ہے۔ مولوی نذیر احمد اور سرسید کی تصانیف بیشتر دینی ہیں۔ مولوی نذیر احمد نے قرآن مجید کا ترجمہ بھی کیا۔ سرسید نے قرآن کی تفسیر لکھی۔

مولانا محمد علی جوہر

مولانا محمد علی بالکل پڑوسی تھے اور مجھ پر کرم فرماتے تھے۔ میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا اور انہوں نے معمول بنا لیا تھا کہ جمعہ کی نماز پڑھ کر سیدھے میرے ہاں آ جاتے تھے اور مغرب کے بعد تک ٹھہرتے تھے۔ مغرب کے بعد اپنے گھر سے کھانا منگاتے اور میرے ساتھ بیٹھ کر کھاتے۔ ذیابیطس کی وجہ سے اُن کا کھانا پرہیزی ہوتا تھا۔ لیڈروں میں مجھے عقیدت اگر کسی سے تھی تو مولانا محمد علی سے تھی۔ مولانا جیسا ہمہ صفت موصوف لیڈر میرے زمانے میں نہیں پیدا ہوا۔ مولانا حسرت موہانی کا سا خلوص' شیخ الہند کی سی دین داری' اقبال کا سا تفکر' اجمل خان کی سی فراست اور خدا معلوم کیا کیا اوصاف اکیلے محمد علی میں جمع تھے۔ وہ وفات نہ پا جاتے تو ہندوستان کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی اپنے کسی دور میں دین سے بیگانہ نہیں رہے۔ مولانا عبدالباری فرنگی محلی کا مرید ہو جانے کے بعد ان دونوں بھائیوں نے وضع قطع اور صورت شکل بھی مسلمانوں کی بنا لی تھی۔ حتیٰ کہ ڈاڑھیاں رکھ لی تھیں۔ ڈاڑھیاں اُن کی دیکھا دیکھی ڈاکٹر انصاری اور مسٹر آصف علی نے بھی رکھی تھیں' مگر ان کی ڈاڑھیاں کچھ دن بعد منڈ گئیں۔ ان دونوں بھائیوں کی ڈاڑھیاں آخر دم تک رہیں"۔

مفتی کفایت اللہ

مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید کا میں نے لیڈروں میں نام نہیں لیا حالانکہ مفتی صاحب تو مولانا محمد علی کی صف کے لیڈر تھے اور مولانا احمد سعید مسٹر آصف علی کی صف کے۔ لیکن ان دونوں کی لیڈری پر اُن کی مفتیت اور مولویت غالب تھی۔ مفتی صاحب کے ہم جماعت مولوی امین الدین نے سنہری مسجد' چاندنی چوک میں ایک مدرسہ دیوبندی طرز کا کھولا تھا "مدرسہ امینیہ"۔ اول اول چار پانچ برس اس مدرسے کے صدر مدرس مولانا انور شاہ کشمیری رہے۔ پھر مفتی کفایت اللہ نے اُن کی جگہ سنبھالی اور مولوی امین الدین رحلت کر گئے تو مدرسہ کا انتظام بھی سنبھالا اور آخر تک نہایت خوش اسلوبی سے مدرسہ چلاتے رہے۔ آج کل مفتی صاحب کے فرزند مولوی حفیظ الرحمٰن مدرسہ امینیہ کے ناظم ہیں۔

مفتی صاحب اور مولوی امین الدین صاحب دونوں کے مکان میرے گھر کے نزدیک تھے۔ میں شام کو ٹہلنے نکلتا تو روز اس مقدس جوڑی کو پریڈ کے میدان کے راستے سے اپنے محلے کی طرف آتے دیکھتا تھا۔ مفتی صاحب ہمیشہ میرے پڑوسی رہے اور 1947ء تک میں نے انہیں مسلسل دیکھا اور قریب سے دیکھا۔ علم کی جگہ علم' فراست کی جگہ فراست اور مومنانہ فراست' توکل' قناعت' سادگی' وضع داری' پابندیٔ سنت کون سی خوبی ہے جو مفتی کفایت اللہ میں نہ تھی۔ کم بولتے تھے' مگر بولتے تھے تو بولنے میں وزن ہوتا تھا۔ حکیم اجمل خان اپنی مجلس اور اپنے مطب میں کسی کی تعظیم کو نہیں کھڑے ہوتے تھے' لیکن مفتی صاحب کے لئے کھڑا ہوتے میں نے دیکھا ہے۔ مفتی صاحب جس وقت مدرسہ امینیہ کی صدر مدرسی کرنے آئے ہیں' وہ مدرسے کا ابتدائی وقت تھا۔ مدرسے کی مالی حالت کمزور تھی۔ مفتی صاحب نے صرف بیس روپے ماہوار پر کام شروع کر دیا۔ پھر تنخواہ بڑھتے بڑھتے دو پچاس تک پہنچ گئی۔ 1370 ہجری میں مدرسے کی مجلس انتظامیہ نے پچیس روپے کا اور اضافہ کیا۔ مفتی صاحب اضافے کے پچیس روپے لے تو لیتے تھے' مگر بطور چندہ مدرسے کو واپس دے دیتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ مجھے ڈھائی سو کافی ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے اور ہندوستان آ کر بھی دلی سے باہر رہے' لیکن اُن کے والد حضرت مولانا خیر الدین دہلوی تھے۔ پنڈت کے کوچے میں مکان تھا۔ مولانا ابوالکلام خود شروع شروع میں اپنے نام کے ساتھ دہلوی لکھا کرتے تھے۔ "محی الدین احمد المکنّٰی بہ ابی الکلام دہلوی کان اللہ لہٗ" لکھنا ابھی بہتوں کو یاد ہوگا۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ میں ابوالکلام کو دلی والوں میں شامل نہ کروں اور دلی کو اُس شرف سے محروم رکھوں کہ اسے مولانا جیسے فاضل' ادیب' مقرر اور مدبر سے نسبت ہے۔ مولانا نے دلی میں بیٹھ کر کام کئے ہیں۔ کام کے اعتبار سے مولانا مودودیؒ کی نسبت مولانا ابوالکلام کو دلی سے زیادہ تعلق رہا ہے۔ ایک زمانے میں دریا گنج والی' حکیم عبدالحمید مالک "ہمدرد دواخانہ" کی کوٹھی لے رکھی تھی۔ اس قیام پر دریا گنج کا علاقہ فخر کر سکتا ہے اور قدیم تعلق پر پنڈت کا کوچہ اور سارا لال کنوئیں کا علاقہ۔

سابق ہندوستان کے مسلمانوں میں جو تھوڑا بہت شعور آ گیا تھا' اس شعور کے پیدا کرنے والوں میں مولانا کا نام خاص امتیاز رکھتا ہے۔ تدبر اور سیاست دانی کی یہ کیفیت ہے کہ آج سے بیس برس پہلے ایک ذمہ دار بزرگ نے پنڈت جواہر لال نہرو کے مندرجہ ذیل الفاظ سنائے تھے۔ پنڈت جی نے فرمایا:

> "میں صرف علمی سیاست ہی نہیں جانتا۔ سیاست کا اسکالر بھی ہوں۔ سیاست کی کتابیں مجھ سے زیادہ ہندوستان میں اوروں نے نہیں پڑھیں۔ پھر تیسرے چوتھے سال یورپ کا پھیرا ہو جاتا ہے' جہاں سیاست کی رفتار قریب سے دیکھنے میں آ جاتی ہے اور میں سمجھنے لگتا ہوں کہ مجھے سیاست کا تازہ ترین علم حاصل ہو گیا۔ لیکن جب ہندوستان واپس آ کر مولانا ابوالکلام سے باتیں کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اب بھی آگے ہیں"۔

اس روایت کے راوی سے میں نے کہا' آپ جانتے ہیں' اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پنڈت جی انسانوں کی تراشیدہ سیاست کے ماہر ہیں اور مولانا قرآنی سیاست کے۔ قرآنی سیاست میں ہلر جلر نہیں ہے۔ ﴿لا تبدیل الکلمات اللہ﴾ (تبصرہ نگار: سید قاسم محمود)

(اس کتاب کا نیا ایڈیشن انجمن ترقی اردو پاکستان' کراچی کے زیر اہتمام شائع ہوا ہے۔)

ضرورت رشتہ

چند سفید ریش' کلاس ون ریٹائرڈ آفیسرز کے لئے لاہور سے دینی رجحان کی حامل موزوں خواتین کے رشتے درکار ہیں: 60 سالہ بانجھ یا بیوائیں جو خاوند کی خدمت کر سکیں۔

رابطہ: مسز رفیع' فون: 7245705 (042)

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں
مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر!

موسیقی اور آلاتِ موسیقی

فرمودات نبویؐ کی روشنی میں

حدیث نمبر 1:

ابو عامرؓ یا ابو مالکؓ کے شاگرد عبدالرحمٰن بن غنم الاشعری کا بیان ہے کہ مجھ سے (ان دونوں میں سے ایک نے) حدیث بیان کی' بخدا انہوں نے مجھ سے جھوٹ بات نہیں کی۔ انہوں نے آنحضور ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ میری اُمت میں ایسے لوگ (یا گروہ) پیدا ہوں گے جو زنا' ریشم' شراب اور گانے بجانے کے آلات کو حلال قرار دیں گے اور کچھ لوگ پہاڑ کے دامن میں اتریں گے جہاں ان کے پاس شام کو مویشی چر کر پہنچیں گے' ان کے پاس کوئی آدمی اپنی ضرورت وحاجت کو لے کر آئے گا تو وہ کہیں گے ''کل آنا'' تو اللہ تعالیٰ اِن کو راتوں رات عذاب میں مبتلا کر دے گا' پہاڑ ان پر گرا دے گا اور دوسروں کو قیامت تک کے لئے بندر اور سور بنا دے گا۔ (صحیح بخاری)

حدیث نمبر 2:

صالح بن عبداللہ فرج بن فضالہ ابو فضالہ شامی یحییٰ بن سعید محمد بن عمر بن علی۔ حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا میری اُمت میں جب پندرہ بری باتیں پیدا ہو جائیں گی تو اُن پر بلا نازل ہوگی۔ عرض کیا گیا یا رسول اللہ ﷺ وہ کیا ہیں؟ فرمایا: جب مال غنیمت ہاتھوں ہاتھ منتقل ہونے لگے گا اور امانت کو مالِ غنیمت سمجھا جائے گا اور زکوٰۃ تاوان بن جائے گی اور مرد اپنی بیوی کا مطیع اور فرمانبردار ہو جائے گا۔ اپنی ماں کی نافرمانی کرے گا دوست کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے گا اور اپنے باپ کے ساتھ برا سلوک کرے گا' مسجدوں میں شور وغل ہوگا قوم کا سردار وہ ہوگا جو اُن میں سب سے زیادہ ذلیل ہوگا۔ لوگوں کی برائی کے ڈر سے اُن کی تعظیم کی جائے گی۔ شرابیں پی جائیں گی۔ ریشم پہنا جائے گا۔ گانے والی لونڈیاں اور گانے بجانے کے آلات رکھے جائیں گے۔ اِس امت کے آخر والے اس کے اگلے لوگوں پر لعن طعن کریں گے۔ اس وقت لوگوں کو لال آندھی یا زمین میں دھنس جانے یا شکل وصورت کے مسخ ہو جانے کا انتظار کرنا چاہئے۔

(سنن ترمذی' کتاب الفتن)

حدیث نمبر 3:

عمر ان بن حصین روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اس امت میں زمین کا دھنس جانا' چہروں کا مسخ ہو جانا اور پتھروں کی بارش کا برسنا ظہور پزیر ہو گا۔ کسی نے پوچھا یہ کب ہوگا؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا: جب گانا بجانا' آلاتِ موسیقی اور پینا پلانا عام ہو جائے گا۔

(سنن ترمذی' کتاب الفتن)

حدیث نمبر 4:

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تونگری کا ذریعہ بنا لیا جائے گا اور امانت کو غنیمت سمجھا جانے لگے گا۔ زکوٰۃ کو جرمانہ سمجھا جائے گا اور حصولِ علم کا مقصد دین کے بجائے کچھ اور ہوگا۔ آدمی اپنی بیوی کی اطاعت کرے گا اور اپنی ماں کی نافرمانی کرے گا اور اپنے دوست کی عزت کرے گا جبکہ اپنے باپ کی توہین کرے گا اور جب مساجد میں آواز بلند کی جائے گی..... اور جب گانا بجانا' آلاتِ موسیقی اور پینا پلانا عام ہو جائے گا..... تو اس وقت سرخ آندھی کا عذاب آئے گا۔

(سنن ترمذی' کتاب الفتن)

حدیث نمبر 5:

حضرت ابی امامہؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے آلاتِ موسیقی اور بانسری کے خاتمے کا' بت' صلیب اور امور جاہلیہ مٹانے کا۔ (مسند احمد بحوالہ الفتح الربانی ۱۷/۲۳۲)

حدیث نمبر 6:

نافع کہتے ہیں کہ ابن عمر نے بانسری کی آواز سنی تو اپنے ہاتھوں کی انگلیاں کانوں میں ٹھونس لیں اور کہا کہ ایک بار میں رسول اکرم ﷺ کے ساتھ تھا تو آپؐ نے بھی بانسری کی آواز سن کر ایسا ہی کیا تھا۔

(ابوداؤد' کتاب الاداب)

نامے مرے نام

گرامی قدر جناب مرزا ایوب بیگ صاحب
امیر تنظیم اسلامی لاہور
السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہٗ

گزشتہ روز کے اخبارات میں آپ کی والدہ کی وفات کی خبر نظر سے گزری۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

اللہ تعالیٰ مرحومہ کو اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے اور جملہ پسماندگان کو صبر جمیل اور اجر جزیل سے نوازے۔

والدہ اللہ تعالیٰ کی ایسی نعمت ہے جس کا بدل کم از کم اس دنیا میں ملنا ناممکن ہے۔ ایسے عالم میں بندہ مومن کی ڈھال اللہ کی رضا پر راضی رضا اور صبر ہی رہی ہے۔ ہم سب کا آخری ٹھکانہ وہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے اور ہر آزمائش سے محفوظ فرمائے۔

میں اس موقع پر آپ اور تمام پسماندگان کی خدمت میں تعزیت عرض کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو یہ صدمہ ہمت کے ساتھ برداشت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

والسلام
اظہر اقبال حسن
قیم جماعت اسلامی پنجاب

محترم ومکرم جناب مرزا ایوب بیگ صاحب
السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

اُمید ہے صحت و ایمان کی سلامتی کی بہترین حالت میں ہوں گے۔

آپ کا ارسال کردہ ''ماہنامہ ندائے خلافت'' کا خصوصی شمارہ سالِ اقبال نمبر موصول ہوا۔ بلاشبہ یہ شمارہ شاعر مشرق حضرت علامہ اقبالؒ کے بارے میں معلومات کا عظیم خزانہ ہے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ آپ نے کوزے میں دریا بند کر دیا ہے۔

بلاشبہ آپ کا یہ عید کا تحفہ نہایت ہی عظیم تحفہ ہے جس پر میں آپ کا بہت مشکور ہوں اور آپ کو اس کی اشاعت پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی وناصر ہو۔

والسلام
خیر اندیش
میاں مقصود احمد
امیر جماعت اسلامی لاہور

حلقہ سرحد (شمالی) اسرہ امیر یکس دیر بالا کا ایک روزہ دعوتی اجتماع

یہ دعوتی اجتماع دیر سے 30 کلومیٹر دور موضع براول بانڈئی میں 7 دسمبر 2002ء کو منعقد ہوا۔ حلقہ سرحد (شمالی) کے ناظم دعوت جناب غلام اللہ حقانی کو خصوصی طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ اجتماع میں شرکت کے لئے دیر سے راقم کے ساتھ 5 رفقاء بوقت 4 بجے عازم سفر ہوئے اور راستے میں چکیاتن کے مقام سے مولانا غلام اللہ خان حقانی کو ساتھ لے کر مقام اجتماع پر پہنچے۔ پروگرام کا آغاز نماز عصر کے بعد ناظم دعوت کے ''فرائض دینی کے جامع تصور'' پر مفصل خطاب سے ہوا۔ اس نشست میں احباب کی تعداد 120 کے قریب تھی۔ خطاب کے بعد مشورہ کیا گیا کہ ایک دوسری مسجد میں بھی دعوتی پروگرام ہونا چاہئے۔ چنانچہ نماز مغرب کے بعد مولانا غلام اللہ خان حقانی نے نیو ورلڈ آرڈر پر خطاب فرمایا جبکہ ممتاز عالم دین مولانا احسان الحق نے فرائض دینی کے تصور کو ایک نئے انداز میں پیش کیا اور تنظیم اسلامی کے ہدف کو سامعین کے سامنے رکھ کر مطالبہ کیا کہ یہ ہم سب کا فرض ہے کہ بحیثیت مسلمان ہم پہلے پاکستان میں اور پھر پورے کرہ ارض پر اللہ کے دین کو باقی ادیان پر غالب کرنے کی جدوجہد میں تن من دھن لگانے کے لئے تیار ہو جائیں۔ اس نشست میں تقریباً 80 افراد نے شرکت کی۔ نماز عشاء کے بعد مولانا غلام اللہ حقانی نے اسی مسجد میں اپنے باقی خطاب کو پورا کیا۔

دوسرے دن نماز فجر کے بعد مولانا غلام اللہ خان حقانی نے ''عظمت قرآن'' پر نہایت تفصیلی درس دیا۔ اس میں 30 افراد نے شرکت کی۔ ناشتہ کے بعد یہ دعوتی اجتماع اختتام پذیر ہوا۔ (رپورٹ: سعید اللہ خان)

مرکز تنظیم اسلامی گجرات میں نماز جمعہ کا آغاز

تنظیم اسلامی گجرات کی تاسیس 1986ء میں ہوئی تھی لیکن اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود مقامی تنظیم کے پاس کوئی ایسا مرکز نہیں تھا جہاں اسلام کے انقلابی فکر کو بیانگ دہل بیان کیا جا سکے اور دین حق کے غلبے کی جدوجہد پر مبنی دعوت کو وسیع پیمانے پر پھیلایا جا سکے۔ اس مقصد کے لئے باقاعدہ کوشش کا آغاز تقریباً دو سال قبل ہوا اور کچھ ساتھیوں کی طرف سے مالی تعاون کے ساتھ ساتھ مرکز کی معاونت سے دس مرلے کا ایک پلاٹ خرید کر اللہ کی نصرت کے سہارے صرف چار ماہ کے قلیل عرصے میں مسجد کا گراؤنڈ فلور مکمل ہو گیا۔ گزشتہ رمضان المبارک کے آخری عشرے سے وہاں پنجگانہ نمازیں باقاعدگی سے شروع کر دی گئی تھیں' لیکن بعض وجوہات کی بنا پر نماز جمعہ کا آغاز نہ کیا جا سکا۔ چنانچہ 4 اکتوبر سے جامع مسجد تقویٰ میں نماز جمعہ کے آغاز کا فیصلہ کیا گیا اور اس کے لئے مرکزی ناظم دعوت و تربیت جناب چوہدری رحمت اللہ بٹر کو خطاب کی دعوت دی گئی۔

اس خطاب کے لئے بینرز' ہینڈ بلز' دعوت ناموں اور ذاتی روابط کے ذریعے بھرپور تشہیر کی گئی۔ جناب رحمت اللہ بٹر نے ''مطالبات دین'' کے موضوع کو منتخب کیا اور سورۃ الحج کے آخری رکوع کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے فرائض دینی کے تصور کو ایک نئے انداز میں حاضرین کے سامنے رکھا۔ انہوں نے دینی فرائض کے لوازمات یعنی اجتماعیت اور قیام جماعت کے مسنون طریق کار بیعت سمع و طاعت کی اہمیت احادیث نبویہ کی روشنی میں اجاگر کی۔ اس کے بعد انہی کی امامت میں نماز جمعہ ادا کی گئی' جس میں 100 کے قریب رفقاء و احباب موجود تھے۔ اس موقع پر بانی تنظیم محترم ڈاکٹر اسرار احمد کی کتب اور کیسٹس کا سٹال بھی لگایا گیا تھا۔ (رپورٹ: عبدالرؤف)

ڈاکٹر احمد جاوید خواجہ کی گرفتاری کے خلاف تنظیم اسلامی حلقہ لاہور کا احتجاجی مظاہرہ

تنظیم اسلامی حلقہ لاہور نے ڈاکٹر احمد جاوید خواجہ کی گرفتاری کے خلاف 25 دسمبر کو بعد نماز ظہر پریس کلب کے باہر ایک احتجاجی مظاہرہ کیا۔ اس میں رفقاء تنظیم اسلامی اور قرآن کالج کے طلبہ نے بھرپور انداز میں حصہ لیا۔ مظاہرین سے خطاب کرتے ہوئے حلقہ لاہور کے امیر جناب مرزا ایوب بیگ نے کہا کہ برصغیر کے مسلمانوں نے جان' مال اور عزت کی قربانی دے کر برطانوی استعمار سے کیا اس لئے آزادی حاصل کی تھی کہ آج کے نااہل حکمران اس قیمتی متاع کو امریکیوں کے پاس رہن رکھ دیں۔ آج یوم قائداعظم پر ہم اس عظیم رہنما کی روح سے سخت شرمسار ہیں کہ پاکستان کو مثالی اسلامی ریاست بنانے کی بجائے ایک ظالم اور اسلام دشمن سپر پاور کی کالونی بنا دیا گیا ہے جہاں رسوائے زمانہ ایف بی آئی پاکستان کے شریف شہریوں کو رات کے اندھیرے میں چادر اور چار دیواری کی صریحاً خلاف ورزی کرتے ہوئے ان کے گھروں سے اٹھا کر لے جاتی ہے اور کوئی ان کا پرسان حال نہیں ہوتا۔ انہوں نے کہا ہمیں امریکہ سے کوئی گلہ نہیں' وہ ہمارا کھلا دشمن ہے۔ افسوس ہمیں اُن حکمرانوں پر ہے جنہیں کرسی کے لالچ نے اندھا کر دیا ہے اور وہ پاکستان اور امت مسلمہ کے اس دشمن کو محض اپنے عیش و آرام کی خاطر وطن عزیز میں دندنانے کی اجازت دے رہے ہیں۔ حکمرانوں کو یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ جو اپنوں کے نہیں بنتے' غیر بھی انہیں کبھی قبول نہیں کیا کرتے اور وہ انہیں اپنا مقصد نکال کر انتہائی ذلت آمیز انداز سے رد کر دیتے ہیں۔ ایسے حکمران ہمیشہ عبرتناک انجام سے دوچار ہوتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اب بھی وقت ہے حکمران اپنا قبلہ درست کر لیں' عوام کو اعتماد میں لیں اور پاکستان اور امت مسلمہ کے دشمنوں سے کہہ دیں کہ ہم اپنے معاملات میں مداخلت کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ ڈاکٹر احمد جاوید خواجہ اور ان کی فیملی کے دوسرے افراد کو فوراً رہا کیا جائے' اگر کسی کے خلاف الزامات ہیں تو پاکستانی پولیس پاکستانی عدالتوں میں ثبوت پیش کرے۔ تنظیم اسلامی کے نائب ناظم تربیت جناب شاہد اسلم نے بھی مظاہرین سے خطاب کیا۔ رفقاء نے بینرز اور پلے کارڈ اٹھا رکھے تھے جن پر یہ نعرے درج تھے:

☆ ہم یوم قائداعظم پر پاکستان کو امریکی تسلط سے آزاد کرانے کا مطالبہ کرتے ہیں۔
☆ امریکہ سے دوستی اس کی دشمنی سے زیادہ خطرناک ہے۔
☆ ڈاکٹر احمد جاوید خواجہ کو فوری رہا کیا جائے۔
☆ پاکستانی قوم فیصلہ کرے: آزادی یا موت۔
☆ کیا برطانیہ سے آزادی امریکہ کی غلامی اختیار کرنے کے لئے حاصل کی گئی تھی؟
☆ حکمرانو! سپریم پاور امریکہ نہیں اللہ ہے۔

اس مظاہرے میں امیر تنظیم اسلامی جناب حافظ عاکف سعید نے خصوصی طور پر شرکت کی اور بعد میں GEO ٹی وی کو اس مظاہرہ کے حوالہ سے تنظیم اسلامی کے موقف سے آگاہ کیا۔ اس موقع پر نیوز ایجنسیوں اور اخباری نمائندوں و فوٹو گرافوں کی کثیر تعداد موجود تھی۔ شعبہ نشر و اشاعت حلقہ لاہور نے اس مظاہرہ کا پریس ریلیز جاری کیا۔ (رپورٹ: وسیم احمد)

تنظیمی اطلاعات

امیر تنظیم اسلامی جناب حافظ عاکف سعید نے مندرجہ ذیل انتظامی تبدیلیوں کا فیصلہ کیا ہے:

☆ ناظم اعلیٰ تنظیم اسلامی جناب ڈاکٹر عبدالخالق کو آئندہ سے تنظیم کے شعبہ نشر و اشاعت کا ناظم مقرر کیا گیا ہے۔
☆ حلقہ سرحد (شمالی) کے امیر جناب اظہر بختیار خلجی کو حلقہ کی امارت کی بجائے ناظم اعلیٰ تنظیم اسلامی کی ذمہ داری تفویض کر دی گئی ہے۔
☆ حلقہ سرحد (شمالی) کے نئے امیر کی تقرری کے فیصلہ تک حلقہ سرحد (جنوبی) کے امیر جناب میجر (ر) فتح محمد حلقہ سرحد (شمالی) کے امیر کی حیثیت سے بھی کام کریں گے۔

ضرورت رشتہ

ایک تیس سالہ دیندار' باریش امریکہ میں الیکٹریکل انجینئر لڑکے کے لئے' 25-20 سالہ دیندار' شرعی پردہ دار' دراز قد' کم از کم گریجویٹ لڑکی کا رشتہ فوری درکار ہے۔ رابطہ کے لئے: 0300-8664705

The unrealistic body images that the Americans see and admire every day in the media are literally eating away at the female backbone of their nation. A cursory look at women's magazines, popular movies and television programs reveal a wide range of images modelling behaviours that directly assault the human skeleton. Irrespective of the social and moral impact of women exercising free choice, the ultra-thin, uncovered women pictured in a magazine sipping a martini or smoking a cigarette are prime candidates for osteoporosis later in life.

In fact, many behaviours made attractive by the popular media, including eating disorders, teen smoking, drinking, and the depression and anxiety disorders that can occur when one does not measure up are taking a major toll on female health and well-being. In 2000, the American Medical Association acknowledged a link between violent images on the screen and violent behaviour among children. In a world where 8-year-olds are on diets, adult women spend $300 million a year to slice and laser their bodies and legal pornography is a $56 billion industry, it is time to note the dangers of uncovered and unhealthy body images for girls and women.

Now that Muslims' "horrific treatment of women" is common knowledge, dieting and working out to wear a string bikini has become a patriotic act. The "war on terrorism" has certainly raised the western awareness of the ways in which women's bodies are controlled by a "repressive Islamic regime" in a far away land, but what about the constraints on women bodies in the West?

Although these problems may seem small in the face of the threat of Al-Qaeda attack and Saddam Hussein's bio-terrorism, there is still a need to better understand how American culture developed to the point that it now threatens the health of its bikini-clad daughters and their mothers. There is also a need to understand why Muslims abhor the US ways to imposing its cultural values through cruise missiles, occupations and media onslaught.

Covered or uncovered? Even if we take religion out of the debate; if the homefront choice is not about morality, still we may see that following western values puts the physical and emotional health of future generations at stake all over the world.

According to Kristof: "I kept asking [Saudi] women how they felt about being repressed, and they kept answering indignantly that they aren't repressed." However, he believes that it is not paternalistic of the West to try to liberate women who insist that they're happy as they are? It might be hard for the cultural imperialists of the West to digest, but the undeniable reality is that Islam doesn't offer choices when it boils down to the right to wear Burqa or bikini.

It is not the eyes of a woman in *purdah* but the anxious darkly circled eyes of a girl with anorexia nervosa -- the woman trapped inside -- that needs to be liberated from the invisible cultural confines of the west. The Burqa and the bikini represent opposite ends of spectrum. We need to find out which one actually exert a noose-like grip on the psyche, social and physical health of girls and women before jeering at others or internationalising our values.

References:

1:http://www.time.com/time/potw/20021220/6.html

2:Nicholas D. Kristof, "Saudis in Bikinis," *New York Times,* October 25, 2002.

3:"Afghanistan war against women," *Boston Globe*, Editorial, March 25, 1999, page-A-22.

KHALID TRADERS

IMPORTERS - INDENTORS - STOCKISTS & SUPPLIERS OF WIDE VARIETY OF BEARINGS, FROM SUPER - SMALL TO SUPER - LARGE

NTN BEARINGS

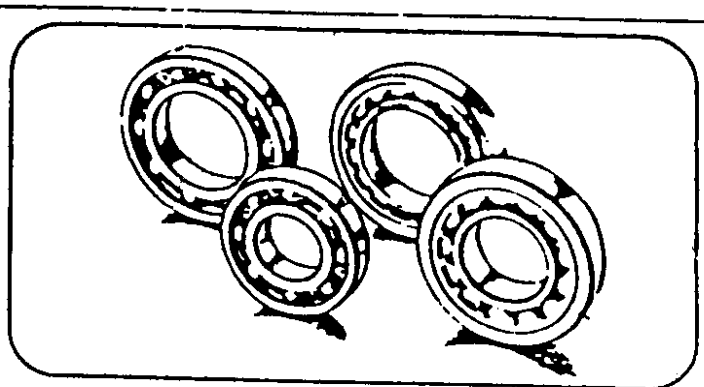

PLEASE CONTACT

Opp. K.M.C. Workshop, Nishtar Road, Karachi-74200, Pakistan.
G.P.O. Box # 1178 Phones : 7732952 - 7730595 Fax : 7734776 - 7735883
E-mail : ktnln@poboxes.com

FOR AUTOMOTIVE BEARINGS : SIND BEARING AGENCY, 64 A-65 Manzoor Square Noman St. Plaza Quarters Karachi-74400(Pakistan)
Tel : 7723358-7721172

LAHORE : 5 - Shahsawar Market, Rehaman Gali No. 4, 53-Nishtar Road, Lahore-54000, Pakistan. Phones 7639618,7639718,7639818, Fax: (42) : 763-9918.

GUJRANWALA: 1-Haider Shopping Centre, Circular Road, Gujranwala Tel : 41790-210607

WE MOVE FAST TO KEEP YOU MOVING

View Point

Abid Ullah Jan
(e-mail: abidjan@tanzeem.org)

The Choice Between Burqa and Bikini

Now that "repressive" Taliban are gone and their "draconian rule" has come to an end, the question that comes to mind after looking at one of the recent Time Magazine's [1] pictures of the week is: why are almost 99 per cent Afghan women still clad in Burqa? What forces them to remain in what *New York Times'* Nicholas D. Kristof calls "tents"? [2]

Some of the Muslims believes it is "the traditional or custom based wearing of Burqa" which is now practiced "by choice as before." They further elaborate their idea: "By choice wearing of Burqa has 2 components to it: 1) It is enforced by the male head of household 2) It is enforced by the fear of potential castigation, or ridicule for not wearing by society." Again the questions is: If all these cultural and traditional forces were in place and 99 per cent women preferred to wear Burqa by choice, why did the Taliban chose to enforce something that was already practiced and why was there so much hue and cry about it?

Burqa was just one aspect of the broader campaign against Islamic values under the cover of targeting Taliban atrocities. Status of women in Afghanistan today shows how biased and how hypocritical that campaign has been all along. Everyone knows that Taliban were not calling the shots in Afghanistan during 2002. American government and its Allies certainly were. The facts regarding women status in Afghanistan during 2002 as published in Human Rights Watch latest report (December 17) proves hypocrisy and biased approach of the western media toward covering events in Muslim world

According to the 57-page report, increasingly harsh restrictions on women and girls have been imposed by local governors, who receive military and financial aid from the US government. The Human Rights Watch says that the situation in Herat is symptomatic of the developments across the country and women and girls are facing new restrictions in several other regions as well.

Co-author of the report Zama Coursen-Neff observed: "Many people out side the country believe the Afghan women have had their rights restored. It's just not true. The women and girls are still being abused, harassed and threatened all over Afghanistan, often by the government troops and officials."

Let's not forget that the same situation prevailed before the Taliban. There was, nevertheless, no one to point out the facts with half as much enthusiasm as they displayed in cooking up myths about repression of women by "religious zealots of the Taliban movement" simply because their stated objective was the establishment of an Islamic state.

RAWA, NOW, Amnesty, Physicians for Human Rights and others are nowhere in the picture to cover mounting women rights abuses under the nose of US and its Allies. *Boston Globe* is no more calling Afghanistan "a death camp for women," in its editorials. [3] No one asks how school boys are being recruited to spy on women and report on their activities to the present government in Afghanistan. No one talks about the continued restrictions on women right to work in the US-controlled Afghanistan. A few publicity stunts of women freedom in Kabul doesn't reflect prevailing situation outside a few sections of Kabul city.

It is not that the forces which unleashed malicious propaganda against the Taliban would remain shut for far too long. According to Human Rights Watch report, in many areas "the local police and troops are enforcing the Taliban-era restrictions." What does it mean? It means the US war for liberalising and liberating the Muslim world has just initiated and the conclusions are being drawn that it is not the Taliban who are repressive, but anyone who follows fundamentals of Islam becomes callous to human rights. Charges of Human or women rights abuses by Muslims would never end with the end of so-labelled theocratic regimes in Muslim world.

In fact, covered in a Burqa or uncovered in a bikini - is a subtle subtext in the "war against terrorism." The United States did not engage in this war to avenge women's rights in Afghanistan. The US war against the Taliban highlights the US objective to fully impose its cultural ways in which, for example, its own cultural "uncovering" of the female body impacts the lives of the whole nation.

It is not the Taliban rule, but the teachings of Islam that dictates that women be fully covered whenever they enter the public realm. And that is one of the many Qur'anic injunctions on which the US has declared its "war on terrorism." Once embraced Islam, one has no choices to make other than obeying what is prescribed in the Holy Qur'an. Islam dictates that women be fully covered in public realm, while a recent US television commercial for "Temptation Island 2" features near naked women.

Although the US seem to have won the war against the Taliban, it is important for it to gain a better understanding of the Muslim's rejection of American culture. Women's behaviour in Western society is all but a single locus of this rejection.

The irony is that the images of sleek, bare women in Western popular media that offend Muslims also represent a major offensive against the health of Western women and girls. During the 20th century, American culture in particular has dictated a nearly complete uncovering of the female form. In Victorian America, good works were a measure of female character, while today good looks reign supreme. From the hair removal products that hit the marketplace in the 1920s to today's diet control measures that seek to eliminate even healthy fat from the female form, American girls and women have been stripped bare by a sexually expressive culture whose beauty dictates have exerted a major toll on their physical and emotional health.